مصحفی نمبر طیار ہے، مفصل اشتہار صفحہ ۶۲ پر ملاحظہ ہو

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ ۱۲ روپیہ ششماہی ۶ روپیہ
ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ ۱۴ روپیہ یا ۱۰ شلنگ

نگار

شششماہی چند روپیہ نمبر نگار کا جنوری نمبر
بوجہ اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۳۴ | فہرست مضامین نومبر سنہ ۱۹۳۸ء | نمبر ۵

ملاحظات ---------- اڈیٹر ---------- ۲
جوش کے کلام کی خصوصیات ---------- یوسف رضا بدایونی ---------- ۹
"چالیس" کی اہمیت مذاہب عالم میں ---------- اڈیٹر ---------- ۳۱
دُنیا کی نہایت ابتدائی کتابیں ---------- محمود بریلوی ---------- ۴۴
تاریخ اودھ کا ایک ورق ---------- شیخ تصدق حسین بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی ---- ۳۹
مثنوی سحر البیان ---------- امیر احمد علوی بی۔اے ---------- ۴۴
سیاسیات یوروپ ---------- اڈیٹر ---------- ۵۲
مکتوبات نیاز ---------- اڈیٹر ---------- ۵۵
باب الاستفسار ---------- اڈیٹر ---------- ۵۸
منظومات ---------- نبی احمد بریلوی۔سکندر علی وجد بی۔اے (عثمانیہ) --- ۶۳
اسلامی ہند ---------- اڈیٹر ---------- ۲۴۳

اصلی برقی قوام (تمباکو، خوردنی تجمیتی فی تولہ ۱۲ھ) جو قطعاً نزلہ نہیں پیدا کرتا شیخ خورشید علی پرفیومر نظیر آباد لکھنؤ کے پتہ سے ملسکتا ہے

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد-۳۴	نومبر ۳۸ء	شمار-۵

ملاحظات

پھر وہی تفریق بوبکر و علی

کچھ دنوں سے لکھنؤ میں سکون تھا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید اب سُنّی شیعہ اپنے اختلافات کو چھوڑ کر متفقہ طور پر ملک کے سیاسی حالات کا مطالعہ کریں گے اور سوچیں گے کہ انھیں کانگرس کے موجودہ دورِ حکومت میں کیا طریق کار اختیار کرنا ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہ خیال غلط نکلا اور فضا پہلے سے زیادہ تاریک ہوگئی

اس کی ابتدا مولانا حسین احمد صاحب کے اس اعلان سے ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے انھوں نے مدح صحابہ کی اجازت دیدی ہے اور اس باب میں ہر ممکن مشورہ و امداد کا وعدہ کیا ہے۔ مولانائے موصوف کا بیان ہے کہ اسوقت تک انھوں نے اس تحریک کے التوا کی سفارش صرف اس امید پر کی تھی کہ وہ اس دوران میں حکومت سے گفتگو کر کے شاید کوئی صورت ایسی پیدا کر سکیں گے جو سنیوں کے لئے قابل اطمینان ہو، لیکن چونکہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے اسلئے انھیں کے کسی سابق فتوے کے مطابق (کہ مدح صحابہ نے اب ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے) سنیوں کے لئے

سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ۔ علی الاعلان سڑکوں پر مدح صحابہ پڑھتے ہوئے گزریں اور قانون کا مقابلہ کریں
چنانچہ اس کی طیاریاں ہو رہی ہیں اور یہ جہاد عظیم ۱۱ رمضان سے شروع کیا جائے گا

مولانا حسین احمد صاحب کے اس اعلان کا عام سنی جماعت نے خیر مقدم کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن ہمارے شہر کے سب سے بڑے ہنگامہ پسند لیڈر ظفر الملک صاحب نے انتہائی جوش و خروش کے ساتھ اس کی پذیرائی کی اور مولانا عبدالشکور صاحب کو اس تحریک کا قاید اعظم مقرر کر کے اعلان کر دیا کہ رمضان المبارک سے بہتر مہینہ اس شہادت عظمیٰ کے حاصل کرنے کا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ سنا جاتا ہے کہ مختلف مقامات سے والنٹیر طلب ہو رہے ہیں، اشتعال انگیز تقریروں سے پبلک کو آمادہ پیکار کیا جا رہا ہے اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے ذبح پر آمادہ کرنے کے لئے تلقین مذہب جاری ہے

اس سے قبل ہم تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر اظہار خیال کر چکے ہیں اور ہمارے نزدیک حکومت نے جو فیصلہ کیا ہے اس سے بہتر فیصلہ ممکن نہ تھا، لیکن وہ لوگ جو بغیر فتنہ و فساد کے اثبات وجود نہیں کر سکتے اور جن کی شہرت کا انحصار ہمیشہ ہنگامہ آرائیوں پر رہا ہے، کیونکر ایسی بات پر راضی ہو سکتے تھے، جو لوگوں کو چین سے بیٹھنے دے اور وہ کیوں قومی مفاد پر اپنے اغراض کی قربانی کرتے۔ وہ صرف موقعہ کے منتظر تھے، بہانہ کی تلاش میں تھے، محض ایک چنگاری چاہتے تھے سو وہ ان کو مل گئی اور مولانا حسین احمد ایسے محترم بزرگ کے ہاتھوں سے ملی

مقامی اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ حضرات بھی کافی مشتعل ہو چکے ہیں اور مدح صحابہ کے جواب میں وہ بھی علانیہ تبرا کہنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن جس طرح میری رائے میں سنیوں کا فیصلہ غلط ہے، اسی طرح شیعوں کا یہ ارادہ بھی درست نہیں۔ اگر دو مخالف جماعتوں میں سے کوئی ایک بھی سنجیدگی و رواداری سے کام لے تو فساد بڑی حد تک رُک جاتا ہے۔ علاوہ اس کے شیعہ حضرات کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اگر سنیوں کی طرف سے مدح صحابہ کی تحریک جاری کی گئی تو حکومت خود اس کے روکنے کی ذمہ دار ہے اور شیعوں کو اپنی طرف سے کسی انتقامی کارروائی کی ضرورت نہیں

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ اگر سنی واقعی حکومت کے فیصلہ کو خلاف انصاف سمجھتے ہیں اور مدح صحابہ کو وہ فریضۂ مذہبی کی حیثیت دیتے ہیں تو ان کو یہ عزم کر لینا چاہئے کہ چاہے کچھ ہو وہ اس فیصلہ کو مسترد کرا کے رہیں گے، لیکن اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ چند آوارہ گرد لڑکوں کو پکڑ کر ان کے ہاتھ میں مدح صحابہ کا جھنڈا دیدیا جائے بلکہ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ پہلے تمام سربرآوردہ سنی قانون شکنی کریں اگر ان کی گرفتاری سے یہ تحریک ختم ہو گئی تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ یہ سب وقتی جوش تھا اور ایسے غیر حقیقی جذبہ کو ختم ہی ہو جانا چاہئے تھا، لیکن اگر سنیوں میں اس سے اور برہمی پیدا ہو گئی تو پھر ممکن ہے کہ حکومت متاثر ہو اور لکھنؤ کی سرزمین میں شیعوں کے علم کے ساتھ ساتھ مدح صحابہ کے جھنڈے کے لئے بھی کوئی جگہ نکل سکے

سچ ہے جب کوئی قوم تباہ ہونے لگتی ہے تو پہلے اس کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ نفع و نقصان کی تمیز کھو بیٹھتی ہے۔ یہ وقت تھا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں، اپنے فروعی اختلافات کو ترک کر کے متفقہ طور پر سوچتیں کہ کانگرس کے موجودہ دورِ اقتدار میں ان کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے، ان کو اپنے بقا و تحفظ اور ملک کی آزادی کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئے، لیکن اس کا کیا علاج کہ مسلمان تو صرف نجات اخروی کا طالب ہے اور وہ ایک دوسرے کا خون بہائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی

گر مسلمانی ہمین ست کہ غالب دارد
وائے گر در پس امروز بود فردائے

کانگرس کے خلاف عام بدظنی

ہمیں حصار سے کامریڈ بدرالدین کا ایک مراسلہ موصول ہوا ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت کانگرس کے خلاف نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں کی دوسری جماعتوں میں بھی کافی بدظنی پیدا ہو گئی ہے

بدرالدین صاحب نے کامریڈ نرسنگھ داس باباجی کے ایک پمفلٹ کا بھی حوالہ دیا ہے جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے وقت تقسیم کیا گیا تھا اس مراسلہ میں درج ہے کہ:-

"کامریڈ نرسنگھ داس نے ۱۸ سال تک گاندھی سیوا سنگ میں کام کرنے کے بعد جب یہ محسوس کیا کہ یہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے تو انھوں نے ۱۹۲۱ء میں اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اس کی برائیوں کو منظر عام پر لانے کے لئے یہ پمفلٹ شایع کیا

باباجی کا بیان ہے کہ کانگرس کا مقصد تو آزادی کامل حاصل کرنا ہے لیکن موجودہ ورکنگ کمیٹی اور "ہائی کمانڈ لیڈرشپ" پس پردہ برطانیہ سے ساز باز میں مصروف ہے۔ چنانچہ بھولا بھائی ڈیسائی جو حد درجہ سرمایہ پرست ہیں کھلم کھلا برطانوی شہنشاہیت کے طرفدار ہیں، اس میں مطلق شک کی گنجایش نہیں کہ اس وقت گجرات اور مارواڑ کے چند متمول سرمایہ دار کانگرس پر قابض ہیں اور ورکنگ کمیٹی ہر وقت ان کا منہ دیکھتی رہتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوتا ہے تو گھنشیام داس برلا کے مکان پر، ہوائی جہازوں اور موٹروں کا کرایہ ادا کرتا ہے تو وہی برلا لیڈروں کی شاندار دعوتیں کی جاتی ہیں، محفلوں کے فوٹو اخباروں میں شایع کئے جاتے ہیں۔ گاندھی جی کو موٹروں میں لئے پھرتے ہیں اور اس سے مقصود صرف سرمایہ داری کی حفاظت ہے ۔ یہ وہی برلا ہیں، جو سری پرکاش، کانگرس کینڈیڈیٹ کے مقابلہ میں حلقہ گورکھپور سے کھڑے ہوئے اور انھیں اپنے سرمایہ کے زور سے کامیاب نہ ہونے دیا، اور یہی وہ برلا ہیں جنھوں نے ڈال چند مہیرا چند ایک غیر کانگرسی نمایندہ کی مدد کر کے کانگرسی نمایندہ

کو شکست دی۔ اسی قسم کے ایک اور سرمایہ دار جمنالال بجاج ہیں جو کانگرس کے خزانچی ہیں اور اپنی دولت کے اثر سے کانگرس کو قابو میں کئے ہوئے ہیں۔

اسوقت کانگرس ورکنگ کمیٹی بالکل مستبدانہ طور پر کام کر رہی ہے اور جمہوریت کا کوئی جذبہ اس کے اندر موجود نہیں ہے۔ اصولاً ہونا یہ چاہیئے کہ پریسیڈنٹ، کیبنٹ کا انتخاب کرے، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ کیبنٹ، پریسیڈنٹ کا انتخاب کرتی ہے اور جو سرمایہ داروں کی حفاظت نہ کرے اسے پریسیڈنٹ نہیں بننے دیا جاتا اور برابر سترہ سال سے یہ کمیٹی ملک کو سبز باغ دکھا رہی ہے اور ملکی ضروریات پورا کرنے میں ناکام ثابت ہوئی"

یہ ہے خلاصہ بدرالدین صاحب کی تحریر کا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگرس اپنا اعتماد ہندوؤں میں بھی آہستہ آہستہ کھوتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں میں جو بدظنی کانگرس کی طرف سے پیدا ہوتی جا رہی ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ مظاہرہ ہے جو کلکتہ کے مسلمانوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف حال ہی میں کیا تھا۔ انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ چونکہ مولانا کانگرس کی مسلم کش پالیسی کے طرفدار ہیں اس لئے نہ وہ امامت کے اہل ہیں نہ خطبۂ عیدین پڑھنے کے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے، مسلمانوں کی اس برہمی کا تعلق صرف اُردو ہندی نزاع سے ہے جو کانگرسی وزراء کی سنسکرت آمیز زبان کی اشاعت سے شروع ہوئی اور جس پر گاندھی جی کی تحریر (موسومہ آنریبل سمپورنانند جی وزیر تعلیم یوپی) نے مہر توثیق ثبت کر دی۔ گاندھی جی نے نہایت صاف الفاظ میں سنسکرت الفاظ کے شمول کی نہ صرف اجازت دیدی ہے بلکہ وہ اسے ضروری و مستحسن قرار دیتے ہیں۔ دہلی میں ڈاکٹر اشرف کے رزولیوشن کا جو حشر ہوا اس سے بھی پبلک واقف ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے جس انداز سے اس رزولیوشن کی مخالفت کی وہ بھی سب کو معلوم ہے بہرحال اب کانگرس نے زبان کے مسئلہ میں کھلا ہوا چیلنج دیدیا ہے اور ورکنگ کمیٹی کا یہ فیصلہ کہ ایک عام مشترک زبان کا نام ہندوستانی قرار دینا چاہیئے بالکل بے معنی ہو کر رہگیا ہے۔ گاندھی جی کے اس بیان نے کہ ہندوستانی زبان میں سنسکرت الفاظ کی کثرت بہت ضروری و مستحسن ہے اب گنجایش کسی کی تاویل کی نہیں رکھی۔ اگر مولانا ابوالکلام کے خلاف کلکتہ کے مسلمانوں نے احتجاج کیا تو اس کا سبب بھی یہی تھا کہ انھوں نے مسلمانوں کی صحیح نمایندگی اس مسئلہ میں نہیں کی اور اگر مسلمان کانگرس سے کٹ کر مسلم لیگ میں شامل ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ بھی کانگرس کی یہی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی ہے

صوبۂ بہار، صوبۂ متوسط اور خود ہمارے صوبۂ یوپی میں جن جن صورتوں سے اُردو زبان کے مٹانے کی کوشش جاری ہے، ان کا علم سب کو ہو گیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کی ذہنیت بھی بے نقاب ہوتی جا رہی ہے ودیا مندر اسکیم کے سلسلہ میں مسلمانوں کی شکایت کا جواب جن الفاظ میں انھوں نے دیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خود ان الجھنوں کو مٹانا نہیں چاہتے اور ہندوؤں کی سنسکرت آمیز زبان کا رواج وہ خود چاہتے ہیں۔ انکے

نزدیک الفاظ "دیا مندر" میں کوئی بات ایسی نہیں جو مسلمانوں کو ناگوار ہو، کیونکہ ان کے نزدیک مندر کے معنی صرف "مکان" کے ہیں، لیکن مسٹر شکلا کی طرح وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مندر کا لفظ کیوں رکھا گیا ہے اور اس کی تہ میں جو ذہنیت کام کر رہی ہے اس سے خود گاندھی جی بھی مغلوب ہیں۔

یو۔ پی میں گرام سدھار کے سلسلہ میں کارکنوں کی ٹریننگ جس زبان میں دی جا رہی ہے وہ مسلمان کیا ہندوؤں کے لئے بھی ناقابل فہم ہے، لیکن یو پی گورنمنٹ باوجود اس علم کے بھی اس سنسکرت نوازی میں مصروف ہے اور کسی شکایت کا اثر اس پر نہیں ہوتا۔

بہرحال میرے نزدیک اب یہ معاملہ شکوہ و شکایت کی حدود سے گزر گیا ہے اور مسلمانوں کی یہ "ہائے ہائے" مجھے پسند نہیں آتی، اگر وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں کا موجودہ طرزِ عمل ان کے لئے نقصان رساں ہے، تو انکو دفع مضرت کے لئے کوئی عملی قدم اُٹھانا چاہئے، کوئی موثر تدبیر اختیار کرنا چاہئے اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے ہیں تو انھیں خاموشی کے ساتھ یہ سب کچھ برداشت کرنا چاہئے۔ یہ روز روز کی شکایت کانگرس یا گاندھی جی سے حد درجہ ذلیل و پست بات ہے اور قطعاً شیوۂ مردانگی کے خلاف

حیدرآباد اور کانگرس تحریک

آخر کار حیدرآباد میں وہی ہو کر رہا جس کی کوشش عرصہ سے جاری تھی اور جس کی تحریک ہندوؤں میں ہنگامۂ کشمیر ہی کے وقت سے پیدا ہو گئی تھی ہندوستان میں صرف حیدرآباد ہی ایک ایسی ریاست ہے، جو اپنے نظم و نسق اور بے لاگ انصاف کی وجہ سے اپنی حیثیت تمام ریاستوں سے جدا رکھتی ہے اور وہاں کوئی غیر مسلم جماعت ایسی نہیں ہے جو پوری آزادی کے ساتھ اپنے مراسم و شعائر ادا کر سکتی ہو۔ لیکن جس وقت سے کشمیری مسلمانوں نے اپنی حکومت کے خلاف جد و جہد شروع کی ہے، اسی وقت سے ہندوؤں میں جذبۂ انتقام پیدا ہو گیا ہے اور وہ کشمیر کا بدلہ حیدرآباد سے لینا چاہتے ہیں۔ اس باب میں ہندو اخبارات نے بھی اس فرقہ وارانہ تحریک کو اُبھارنے میں کم حصہ نہیں لیا اور کشمیری مسلمانوں کی خالص سیاسی تحریک کو مذہبی رنگ دیکر ہندو مسلم سوال پیدا کر دیا

جس حد تک امن و سکون اور انفرادی یا اجتماعی آزادی کا سوال ہے، کشمیر اور حیدرآباد میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم روا رکھا جاتا ہے اور جس بیدردی کے ساتھ اُن کی اقتصادی و اخلاقی حیثیت کو پامال کیا جا رہا ہے، اس کی نظیر دنیا کی کسی حکومت میں نہیں مل سکتی اور ہر وہ شخص جسے ایک بار بھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہے، برخلاف اس کے حیدرآباد میں جا کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ وہاں ہندوؤں کو تمام وہی آسانیاں اور آزادیاں حاصل ہیں جو برطانوی ہند میں پائی جاتی ہیں بلکہ اقتصادی حیثیت سے وہ مسلمانوں سے بدرجہا بہتر حالت میں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ملازمت میں ان کا تناسب ان کی آبادی کے لحاظ

سے کم ہو، لیکن اول تو وہ اتنے خوشحال ہیں کہ انھیں نوکری کی ضرورت ہی نہیں اور اگر ہو تو بھی تمام امتحانات مقابلہ میں ان کو آزادی کے ساتھ شریک کیا جاتا ہے اور اسوقت کوئی محکمہ وہاں ایسا نہیں ہے جس میں وہ بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز نہ ہوں

بہرحال ہندؤں کا یہ پروپاگنڈا کہ انھیں وہاں مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے یا یہ کہ اقتصادی و تمدنی حیثیت سے ان کے ساتھ وہاں انصاف نہیں ہوتا، بالکل لغو و بے معنی سی بات ہے، البتہ حیدرآباد کا ایک مسلمان ریاست ہونا اور وہ بھی سب سے بڑی ریاست ہونا بجائے خود ایک ایسا واقعہ ہے جو ہندؤں کو کبھی خوش نہیں آسکتا اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اگر وہاں ہندو راج قایم نہیں ہو سکتا تو کم از کم اس کو بیدست و پا کر دیا جائے

کانگرس کا دعویٰ ہے کہ وہ ریاستوں کے اندر ایسی سیاسی تحریکوں سے اپنے آپ کو متعلق کرنا پسند نہیں کرتی، لیکن اسی کے ساتھ چونکہ اس کا نام اس نے جنگ آزادی رکھا ہے اس لئے انسانیت و حریت کے نام سے وہ ہمیشہ اس میں حصہ لیتی ہے جیسا کہ میسور اور ٹراونکور میں دیکھا گیا ہے۔ اس لئے گو حیدرآباد کی کانگرسی جماعت بظاہر آل انڈیا کانگرس کی کوئی مسلمہ شاخ نہ ہو، لیکن بہرحال اس کے "بچۂ شتر" ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور قانون شکنی کے لئے جس ستیاگرہ کا وہاں آغاز ہوا ہے، اسے ایک نہ ایک دن مستقل فتنہ کی شکل اختیار کر لینا ہے

کچھ دن قبل جو ہندو مسلم فساد حیدرآباد میں ہوا تھا اس کے متعلق فی الحال کوئی رائے زنی کرنا مناسب نہیں کیونکہ معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہے، لیکن اس کا اقرار کرنا پڑے گا کہ حصول انصاف کے لئے ریاست حیدرآباد نے جو مراعات ہندؤں کے ساتھ کی ہیں اس کی نظیر کسی حکومت کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ البتہ اسی سلسلہ میں وہاں آیندہ فتنہ کا سدباب کرنے کے لئے ایک قانون ضرور نافذ کر دیا گیا ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ فتنہ و فساد پھیلانے والے وہاں نہ آسکیں اور اندرون ملک میں کسی ایسی جماعت کی تشکیل نہ ہو سکے جس سے نقض امن کا اندیشہ ہو۔ یہ کوئی نیا قانون نہیں، کوئی مستبدانہ بدعت نہیں ہے، دنیا کی تمام حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ امن و سکون کو قایم رکھیں اور اُن عناصر کی بیخ کنی کریں جو فساد و اشتعال کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے کانگرسی خیال کے لوگوں نے اسی قانون کے خلاف احتجاج کیا ہے اور اسی کے توڑنے کے لئے وہاں جتھوں کی روانگی شروع ہو گئی ہے

ایسی صورتوں میں حکومت کا اولین فرض یہی ہوا کرتا ہے کہ وہ سختی کے ساتھ قانون کی پابندی کرے اور ہمیں یقین ہے کہ آنریبل سر اکبر حیدری کی صدارت عظمیٰ میں وہی ہوگا جو ہر لحاظ سے قیام آئین و بقائے سکون کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کو بھی متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور اس سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ریاستوں میں اس قسم کی تحریکوں کا آغاز اس جدید کانسٹی ٹیوشن کو دیکھتے ہوئے جس کو اہل کانگرس نے قبول کر لیا ہے، مفید ہو سکتا ہے

وفاق کا نفاذ ہونے والا ہے جس میں بڑا اہم عنصر ریاستوں کا ہے اور یقیناً برطانوی ہند اس سے کوئی فایدہ نہیں اُٹھا سکتا اگر ریاستوں کی ہمدردی اسے حاصل نہ ہو۔ اور یہ صرف اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ ان کی آزادی پر حملہ نہ کیا جائے اور غالباً یہی وہ مصلحت تھی جس کی بنا پر اس وقت تک کانگرس نے ریاستی رقبوں کو اپنے دائرۂ عمل سے باہر رکھا تھا

بہ سلسلۂ قیام وفاق جو کشمکش ریاستوں اور برطانوی حکومت کے درمیان جاری ہے اس سے کانگرس ناواقف نہیں اور ریاستیں بھی جانتی ہیں کہ کانگرس نے ریاستوں کی شرکت کے لئے ان پر کیا پابندیاں عاید کرنا چاہی ہیں۔ اس لئے بحالت موجودہ برطانوی حکومت، کانگرس اور ریاستیں سب ایک دوسرے سے اُصولی اختلاف رکھتی ہیں اور جس وقت وفاق کا نفاذ ہوگا تو لازماً ان تین قوتوں میں سے دو کا کسی ایک بات پر متحد ہونا ضروری ہے پھر یا تو یہ اتحاد کانگرس اور حکومت برطانیہ کا ہوگا یا حکومت اور ریاستوں کا یا کانگرس اور ریاستوں کا۔ صورت اول میں چونکہ ریاستوں کی آزادی کا سلب ہو جانا یقینی ہے جسے حکومت برطانیہ خود بھی اپنے مصالح کے لحاظ سے مناسب نہیں سمجھتی اس لئے یہ ناممکن العمل ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جس سے برطانوی حکومت کے اغراض زیادہ پورے ہو سکتے ہیں اور اسی پر زور دیا جا رہا ہے لیکن ملک کی آزادی کے لئے مفید نہیں، اب رہی تیسری صورت یعنی کانگرس اور ریاستوں کا اتحاد جس سے واقعی ملک کو فایدہ پہونچ سکتا ہے، سو اس کا حصول اسی طرح ممکن ہے کہ کانگرس ان کی ہمدردی حاصل کرے اور وہاں کسی ایسی تحریک کا آغاز نہ ہونے دے جو ان کی آزادی یا ملوکیت کے منافی ہو۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ ہندوستان کو کسی نہ کسی دن پوری طرح آزاد ہونا ہے، لیکن ایسی صورت میں جبکہ کانگرس خود بھی مکمل آزادی کی متمنی نہیں اور برطانوی سایۂ عاطفت کو اپنے لئے ناگزیر سمجھتی ہے، اسے کیا حق حاصل ہے کہ وہ ریاستوں میں کسی ایسی تحریک کا تجربہ کرے جس کے انجام کا کوئی صحیح تخیل خود بھی ابھی تک قایم نہیں کر سکی ہے۔ علاوہ اس کے ہندو مسلم بدمزگی یوں بھی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اگر یہ سلسلہ ریاستوں میں بھی قایم ہو گیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ملک کی آزادی سے پہلے اس فتنہ کا انسداد ضروری ہوگا اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ برطانوی حکومت اس سے فایدہ اُٹھا کر اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل نہ کر لیگی اور ملک کی آزادی کا سوال پھر پچاس سال کے لئے پس پشت نہ ڈال دیا جائے گا

مصحفی نمبر طیار ہے، مفصل اشتہار صفحۂ ۶۲ پر ملاحظہ ہو

جوش کے کلام کی خصوصیات

(مسلسل)

نئی راہیں اُردو شاعری کا بنظرِ تعمق مطالعہ کرنے سے ایک تلخ حقیقت کا نہایت شدید احساس ہوتا ہے، یعنی یہ کہ ہمارے شعراء نے محض تقلید سے کام لیتے ہوئے محبوب کی بعض مخصوص حرکات و کیفیات پر ہی اپنی توجہ منعطف کی ہے۔ دیگر محاسن تک یا تو ان کی نظر ہی نہیں پہونچی یا مقلدانہ ذہنیت کے باعث کسی قسم کے اجتہاد سے کام لینے میں ان کو جھجک محسوس ہوئی۔ وگرنہ سچ پوچھئے تو زلف و ابرو اور چشم و عارض کے علاوہ اور بھی دلکش محاسن محبوب میں موجود ہیں۔ کسی نے صحیح کہا ہے:۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

جوش کو اس نکتہ کا پورا پورا احساس ہے۔ مستغربین کے بارے میں اس کا یہ قول نقل کیا جا چکا ہے کہ:۔

پائی ہے ترکیب میں ان لوگوں نے ہر لے ہر صدا — ان کے لب پر بھی وہی ہے جو ولی کے لب پہ تھا
سلسلہ ان کے سخن کا دور تک ہوتا نہیں — کون ہوان میں جو بالآخر "کُڑک" ہوتا نہیں

اس کے برخلاف ایک حقیقی شاعر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

راستے کا ذرہ ذرہ جس کو دیتا ہو صدا — نظم کرتا جا مجھے بھی شاعرِ رنگیں نوا
روز و شب مجبور ہو جو سیر کرنے کے لئے — ہر نفس اک وادیِ نو سے گزرنے کے لئے
چند شعبوں ہی میں گم ہونے نہ پائے جسکی ذات — جس کا موضوعِ سخن ہو کل نظامِ کائنات

اس کا کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل وہ "ہر نفس اک وادیِ نو" سے گزرتا ہے اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کا موضوعِ سخن ہے۔

محبوب کے "شیوہائے غیر مسمّٰی" پر بھی اُس نے طبع آزمائی کی ہے اور حسینانِ جہاں کے نئے نئے انداز وں پر

روشنی ڈالی ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے :۔

یوں چپ ہے مجھ سے گویا کچھ کام ہی نہیں ہے
یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے!

"جنگل کی شہزادی" کی تعریف یوں کرتا ہے :۔

صحرا کی زیب و زینت، فطرت کی نور دیدہ
برسات کے ملائم تاروں کی آفریدہ
لوہا تپانے والی جلووں کی ضو فشانی
سکے بٹھانے والی اُٹھتی ہوئی جوانی
ڈوبے ہوئے سب اعضا حسن مناسبت میں
پالی ہوئی گلوں کی آغوشِ تربیت میں
تصنیف ہوں ہزاروں چھپتے ہوئے فسانے
ان انکھڑیوں کی ضد پر کانپیں شراب خانے

ایک نظم کا عنوان ہے "اُٹھتی جوانی"۔ اس کے دو بند ملاحظہ فرمائیے اور جوش کی جدت طراز فطنت کی داد دیجئے :۔

سدھی ہوئی اس غضب کی پلکیں
کہ آنکھ چلتے ہی دل میں ڈوبیں
منجھی ہوئی اس بلا کی چٹکی
کبھی نہ خالی گیا نشانہ

وہ رُخ پہ طوفان کیف شب کے
کہ لیکے انگڑائی منہ اندھیرے
لے جو آنکھیں ہتیلیوں سے
ٹپک پڑے بادۂ شبانہ

آخری شعر بغور ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس کے پڑھتے ہی ہمارے قلب پر سرور و انبساط کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے ہم اپنے آپ کو ایک دوسری دنیا میں متصور کرنے لگتے ہیں۔

متغزلین نے اپنے محبوب کی شان میں دفاتر بے معنی سیاہ کر ڈالے ہیں۔ اس کی توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے مگر جوش کی جدت پسند طبیعت نے جو تصویر پیش کی ہے، فطرت اور واقعیت کے لحاظ سے بے نظیر ہے :۔

نوخیز، حسیں، بلند، بالا،
اوڑھے ہوئے سُرمئی دوشالا
فردوس کے در کھلے ہوئے باز
ٹیکے ہوئے کہنیاں بصد ناز!
رنگین کلائیوں کو جوڑے
چہرے کو ہتیلیوں پہ رکھے
گلدان میں پھول ہنس رہا ہے
قرآں ہے کہ رحل پر رکھا ہے

"بسیار شیوہاست بتاں راکہ نام نیست" کا بھی جوش دل سے قائل ہے۔ ان "بسیار شیوہا" میں سے بعض ملاحظہ فرمائیے :۔

یہ شہابی رنگ نازک جلد میں رُخسار کی
خون کا یہ رقص تہ میں عارض گلنار کی

سُرخ آنچل کا ڈھلک جانا یہ سر سے بار بار — دونوں ہاتھوں سے چھپا لینا یہ منہ بے اختیار
گفتگو یہ سر جھکا کر شرمگیں انداز سے — یہ گرہ ہر لفظ میں رکتی ہوئی آواز سے

ذرا ان اشعار کو بغور پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا جوش کو ندرتِ بیان اور جدتِ مضامین میں یدِ طولیٰ حاصل نہیں ہے؟ غالباً اردو شعرا میں قدرت نے "فطنتِ شاعرانہ" (POETIC GENIUS) بمشکل کسی دوسرے شاعر کو اس قدر وفور کے ساتھ ودیعت کی ہو اور یہی باعث ہے کہ جوش کی شاعری نہ صرف بلحاظ ندرت و لطافت بلکہ دیگر کمالاتِ شاعری کو معیار قرار دیتے ہوئے بھی کسی بڑے سے بڑے شاعر سے فروتر نہیں ہے۔ شاید انھیں وجوہ کی بنا پر اردو کے ایک وقیع انشا پرداز نے فرمایا ہے کہ:- "جوش کے کلام کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے دن کے وقت یہ کہنا کہ آفتاب نکل آیا ہے"[1]

نظریۂ عشق

عموماً متغزلین کے یہاں عاشق کی ہستی کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ اُس کی ہر سانس محبوب کی دہلیز ہی میں گزرتی ہے۔ وہ زندہ صرف اس لئے ہے کہ محبوب کے جور و ستم برداشت کرے۔ وہ اپنی ہستی کو مستقلاً پست متصور کئے ہوئے ہے۔ روزانہ محبوب کی بارگاہ میں "نیازمندانہ" انداز سے اپنا احوال سناتا ہے لیکن وہ بیدرد اعتنا نہیں کرتا۔ اگر حسنِ اتفاق سے کہیں محبوب نے اس پر ایک نظرِ التفات ڈال دی تو گویا اس کی معراج ہوگئی مگر جوش کا نظریۂ عشق اس لایعنی اور قبیح خوشامد کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اس "مغلوبانہ ذہنیت" (DEFEATIST MENTALITY) کا قایل نہیں۔ اس کے نزدیک عاشق کا وجود بھی لابُد اور لازمی ہے۔ اس کی ہستی بھی اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ اہم ہے جتنی محبوب کی۔ اس کا خیال ہے کہ:-

اپنا نت گوارا نہیں عاشقی کی — غلامی میں بھی سروری چاہتا ہوں

یہ نہیں ہے کہ وہ پرستشِ محبوب کے خلاف ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ "پندارِ عاشقی" بھی ملحوظ ہے:-

مزاجِ تمنائے خود دار، توبہ! — عبادت میں بھی داوری چاہتا ہوں

محبوب کو غلط فہمی ہے کہ اُس کی ذات پر تمام عشاق کی ہستی کا دارومدار ہے، لیکن جوش کا قول ہے کہ حسن فی الاصل کوئی چیز نہیں صرف عشق کے باعث حُسن حُسن ہوگیا۔ چنانچہ محبوب کی اس غلط فہمی کو یوں رفع کرتا ہے:-

اے حسن! اگر عشق خریدار نہ ہوتا — یہ غلغلۂ گرمیِ بازار نہ ہوتا
اے حسن! داد دے کہ تمنائے عشق نے — تیری حیا کو عشوۂ ترکانہ کر دیا

اس کا عقیدہ ہے کہ حُسن کو جو اہمیت دی جاتی ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ عشق کی توجہ اس کی جانب منعطف ہے چنانچہ کہتا ہے:-

اے حسن! شاد ہو کہ تجھے چشمِ شوق نے — آشوبِ چشم و فتنۂ دوراں بنا دیا

---

[1] نگار - جولائی ۱۹۳۲ء

فیضِ نگاہِ عشق نے اے دفترِ جمال! — تیرے ہر ایک جزو کو قرآں بنا دیا
اے نازِ داد دے کہ سرابِ جمال کو — میری نظر نے چشمۂ حیواں بنا دیا!

بالآخر ایک "جذبۂ متعلّیانہ" کے ماتحت کہہ اُٹھتا ہے کہ:-

کج کر کلاہِ فخر کہ تیرے شباب کو — میں نے خدائے عالمِ امکاں بنا دیا!!

محبوب کی بے التفاتی کے خلاف احتجاج کرنا متغزلین کا عام شیوہ ہے۔ اپنی فریاد و بکا سے غالباً وہ اہلِ زمانہ کی ہمدردی اپنی موافقت میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جوشؔ اس عالمِ مفارقت میں بھی "عاشقانہ وقار" کو قائم رکھتا ہے۔ وہ اپنا مرتبہ "گدایانہ" نہیں بناتا۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ "وہ اپنے حُسن سے محفل، میں اپنے عشق سے بزم!!"
بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:-

اُس طرف حُسن خود سر و خود بیں — اِس طرف عشق ضابط و خود دار
اُس طرف ناز و دلبری کا شکوہ — اِس طرف شعرِ بیخودی کا وقار
اُس طرف حسن غرقِ صد نخوت — اِس طرف عشق محوِ صد پندار

یہ تو ہجر و مفارقت کی حالت تھی لیکن اگر اُسے محبوب کی خلوت میں بھی باریابی ہوتی ہے تب یہ نہیں ہوتا کہ وہ غلامانہ انداز میں اپنا احوالِ درد و غم سنائے۔ برخلاف اس کے، عاشق کو یہاں بھی اپنی "پوزیشن" کا احساس رہتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کسی طرح عشق کی توہین ہو جائے۔ سنئے:-

اُس طرف عہد ہے نہ سننے کا — اِس طرف بند ہیں لبِ گفتار
مجھ کو یہ کد وہ ہوں تبسم ریز — اُن کو یہ ضد کہ یہ کرے اصرار

صدق و وفا اس تمام بحث سے یہ نہیں مستنبط کر لینا چاہیے کہ جوشؔ اُلفتِ محبوب میں اخلاص و صداقت کے خلاف ہے۔ اس کے بالکل برخلاف وہ ہر وقت مجسّم وفا ہے۔ اس کی ہر سانس داستانِ اُلفت کی راوی ہے:-

وفا شعار ہوں ترکِ وفا نہیں کرتا — کبھی نمازِ صبوحی قضا نہیں کرتا

محبوب کے مظالم کے باوجود وہ یہ کہتا ہے کہ:-

نقشِ خیالِ دل سے مٹایا نہیں ہنوز — بیدرد! میں نے تجھ کو بھلایا نہیں ہنوز

صرف یہ کہ محبوب کو فراموش نہیں کیا بلکہ حقیقتِ امر یہ ہے کہ رشتۂ موانست اسی طرح مضبوط ہے:-

تیری ہی زلفِ ناز کا اب تک اسیر ہوں — یعنی کسی کے دام میں آیا نہیں ہنوز

ایک دوسرے مقام پر اسی مطلب کو واضح کرتا ہے:-

یہ مگر وہم ہے اے پیکرِ حسن و تنویر — کہ یہ دل اب ہے کسی اور کی زلفوں کا اسیر

اس نکتہ کی مزید تصریح یوں کی ہے :۔

یادش بخیر جس پہ کبھی تھی تری نظر — وہ دل کسی سے میں نے لگایا نہیں ہنوز!

انسان کی فطرت کا تقاضیٰ ہے کہ جب کوئی شے مفقود ہو جاتی ہے تب اس کی اصل قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ محبوب نے "بزمانۂ التفات" جو الطاف و احسانات کئے تھے وہ اب تک عاشق کے نقشِ ذہن ہیں :۔

گردن کو آج بھی تری بانہوں کی یاد ہے — یہ منتوں کا طوق بڑھایا نہیں ہنوز!

اس کو پوری طرح احساس ہے کہ محبوب کی نگاہ بدل گئی ہے، وہ اب ملتفت نہیں ہوگا۔ لیکن اس کی خوش اعتقادی کا یہ عالم ہے کہ کہتا ہے :۔

وہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے مدت سے — یہاں جفا پہ وفا کا گمان باقی ہے

پھر نہایت فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ :۔

جفا کا اب نہیں اگلا سا بانکپن قایم — مگر وفا کی وہی آن بان باقی ہے

غرض یہ کہ محبوب کے مظالم کے باوجود جوش کے نزدیک ہر حالت میں وفاداری کا ثبوت دینا چاہئے کیونکہ دنیائے محبت میں عشق اور وفا لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اعلائے محبوب

جوش کے نظریۂ عشق کے مطابق ایک عاشق کو خود دار اور باوقار ہونا چاہئے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک محبوب کا مرتبہ کیا ہے؟ کیا وہ فرعی اور ثانوی حیثیت رکھتا ہے؟ اور کیا عاشق کے معیار و مرتبہ کے بلند کرنے میں جوش نے محبوب کے مرتبہ کو کسی حد تک فروتر بنا دیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ عاشق کے مرتبہ کو بلند کرنے کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ محبوب کا مرتبہ بھی بالاتر ہو جائے کیونکہ جب عشق باوفا ہوگا تو فطرتاً وہ اپنی تمناؤں کے مرکز یعنی حسن کو بھی عظمت و افتخار کی نگاہ سے دیکھیگا۔ وہ محبوب سے نہایت فخریہ انداز سے کہیگا :۔

اپنی رفتار پہ ہے کوثر و تسنیم کو ناز — کاکلیں چھوڑ کے شانوں پہ خراماں ہو جا!

ایک دوسری جگہ یہی مفہوم اس طرح ادا کیا ہے :۔

بل ابروؤں پہ ڈال کے زلفوں کو کھولدے — کونین کو اسیرِ کمان و کمند کر!

جوش کو محبوب کی عظمت کا جسقدر احساس ہے اس کا اندازہ اس شعر سے ہو سکتا ہے :۔

کفر سجدے میں گرے، دین کی نبضیں چھٹ جائیں — آج آ، دوش پہ بکھرائے ہوئے یوں گیسو!

نہ صرف یہ کہ جوش کو اپنے محبوب کی عظمت کا احساس ہے بلکہ اس کا خیال ہے کہ ہر "اہلِ نظر" کو اپنا محبوب اتنا ہی ذی مرتبت اور عزیز معلوم ہوتا ہے۔

آؤ پھر جلوۂ جاناں پہ لٹا دیں کونین شغل پارینۂ ارباب نظر تازہ کریں

بالفاظ دیگر، جلوۂ جاناں پہ کونین نثار کر دینا فی الحقیقت عشاق کا شیوۂ دیرینہ ہے!

اس ضمن میں ایک نکتہ ملحوظ رہے۔ جوش نہ صرف اعلائے محبوب کا متمنی ہے بلکہ اس کا عقیدہ ہے کہ محبوب کی عظمت کے باعث جسقدر بھی اشیاء اس سے متعلق ہیں وہ سب ذی قدر ہو جاتی ہیں، ایک جگہ لکھتا ہے:-

ہاں آسمان! اپنی بلندی سے ہوشیار لے سر اُٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

محبوب کے باعث اس کے آستانے کا یہ مرتبہ ہو جانا کہ اس پر سر رکھ دینے سے سر بھی اتنا ارفع و اعلیٰ ہو جائے کہ آسمان کو اپنی بلندی سے ہوشیار ہو جانا پڑے ایک ایسا دعویٰ ہے کہ جس کو مبالغہ پر محمول کر سکتے ہیں لیکن اس سے کم از کم یہ تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ جوش کے دل میں محبوب کی کس قدر عظمت و مرتبت ہے

التفات محبوب جوش نے اپنا نظریۂ عشق پیش کرتے ہوئے جہاں اور بہت سی اختراعات اور جدتوں سے کام لیا ہے اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ اُس کا معشوق محض ظالم، عاشق کش جابر و قاہر اور بے التفات ہی نہیں ہے بلکہ محبوب کو بھی احساسِ محبت ہے اور حقیقت امر یہ ہے کہ ایک حسین و جمیل ہستی کو خواہ مخواہ ظالم قرار دیدینا خود اپنی جگہ پر ظلم ہے۔ جگر نے صحیح کہا ہے:-

ان شاعرانِ دہر پہ ہو عشق ہی کی مار اک پیکرِ جمیل کو قاتل بنا دیا

لیکن جوش ان "شاعرانِ دہر" میں نہیں جو اس "پیکرِ جمیل" کو قاتل قرار دیتے ہیں۔ جوش کا محبوب بھی اُس سے ملنے کے لئے اس قدر بیتاب رہتا ہے (بیتاب رہتی ہے؟) جیسا کہ تقاضائے موانست ہے۔ اس سلسلہ میں ارسالِ تحفہ و پیام بھی ہوتا ہے۔ دونوں جانب سے اظہارِ محبت بھی کیا جاتا ہے اور سچ پوچھئے تو یہ نظریہ اس مقلدانہ فرسودہ نظریہ سے زیادہ نیچرل ہے جس میں معشوق کو صیاد سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے چند مثالیں درج کرنا ضروری ہیں۔ تحفہ و پیام ملاحظہ ہو:-

یہ کس نے جوش کو بھیجے ہیں ناز پرور پھول شگفتہ پھول، جواں پھول، خلد پیکر پھول!

"زرد کلیاں" جوش کی مشہور نظم ہے۔ وہ بھی اسی نظریہ کی آئینہ دار ہے۔ کلیوں کے ذریعہ محبوبہ نے جو پیام بھیجا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:-

اب حد سے سوا ہے خستہ حالی نزدیک ہے وقتِ پائمالی،
آنا ہو تو آ، کہ دل ہے بیتاب ایسے میں ابھی چمن ہے شاداب
جلد آ، کہ فروغِ رنگ و بو ہو
قبل اس کے کہ خونِ آرزو ہو!

"التفاتِ یار کے دورِ طرب آہنگ میں" موانست و ملاطفت کا یہ عالم تھا کہ :۔

مست راتوں میں بہ فیضِ ارتباطِ حسن و عشق
میہمانی کے مزوں میں میزبانی کے مزے
کمسنی کی خوابگاہوں میں پئے تکمیلِ شوق
جُرعہ جُرعہ پی کے مے افسانہ خوانی کے مزے

ظاہر بیں نظروں کو شاید یہ گمان ہو کہ جوش کو اس التفاتِ یار سے سرور و انبساط حاصل ہوتا ہوگا۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جوش کو اپنے آرامِ جاں کی بجینی سے اور بھی تشویش و کوفت ہوتی ہے۔ وہ استعجاب آمیز طریقہ سے کہتا ہے :۔

جس کے قدموں پہ ہو خود فطرت کا سر
وہ پڑھے اور مجھ سے ملنے کو نماز
آہ، وہ اور اس طرح مجھ سے ملے
خود اُٹھاتی ہو جوانی جس کے ناز

"جفائے وفا" کے عنوان سے اسی مفہوم کو پیش کیا ہے :۔

دل کی بستی میں کیوں نہ ہو کہرام
آہ یہ نامہ، ہائے یہ کہرام
کاش اسوقت مجھ کو موت آجائے
آگ میں پھول کس سے دیکھا جائے
کاش وہ یوں نہ بادفا ہوتی،
بانیِ ظلم نارروا ہوتی،
بول اے نامہ بر! جیوں کیسے
پھر تو دوہرا یہ کیا کہا اُس نے
"آنکھ کھلتے ہی صبح تیری یاد
دل پہ کرتی ہے جانے کیا بیداد
دل مرا غرقِ یاس رہتا ہے
شام تک جی اُداس رہتا ہے!"

عہدِ تمنا کی یاد

محبوب کی اس لطف آمیز روش کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بزمانۂ مفارقت عاشق کو یہ سب الطاف و عنایات ایک ایک کرکے یاد آئیں گی۔ وہ متعجب ہوگا اور تلونِ زمانہ پر حیرت کریگا کہ :۔

"لوگ ایسے بھی دنیا میں بدل جاتے ہیں!" جوش کے زمانۂ فراق کا بھی یہی عالم ہے اس کو ہر ہر قدم پر محبوب کے عہدِ تمنا کی یاد ستاتی ہے۔ وہ اس کی دیرینہ ملاطفت کو یاد کرکے ایک آہِ سرد کھینچتا ہے۔ اگر کہیں محبوب سے خطاب کرتا ہے تو اس امر کی جانب خاص اشارہ کر دیتا ہے :۔

دل نے بخشا تھا تقاضائے زلیخا تجھ کو
یاد ہے وہ خلشِ عہدِ تمنا تجھ کو؟

اس "تقاضائے زلیخا" والے عہدِ تمنا کی کس قدر پُرتاثیر تشریح کی ہے :۔

نرگسِ ناز میں یوں اشک بھرے رہتے تھے
نظر آتا تھا ورق دہر کا دُھندلا تجھ کو!
روزِ باراں میں ستاتا تھا غمِ عشق تجھے
شبِ مہتاب میں ڈستی تھی تمنا تجھ کو!
ہر گھڑی میری حضوری کی تمنا تھی تجھے
ہر نفس میری جدائی کا تھا کھٹکا تجھ کو

کیا قیامت تھی کہ اس گلبدنی کے باوصف
روز کانٹوں پہ لٹاتی تھی تمنا تجھ کو

پھر ایک آہِ سرد کھینچ کر کہتا ہے :-

جوش سے پوچھ! کہ اب تک ہے اُسے یاد وہ دور
کہ کبھی مہر و وفا کا بھی تھا دعوے تجھ کو!

ایک دوسری جگہ اسی دورِ تمنا کی تصویر اس طرح پیش کی ہے :-

کاوشِ ذوقِ نظر بازی کی راتیں ہائے ہائے
دیدۂ مخمور جب میرے لئے بیخواب تھا

ذرا مختلف الفاظ میں یہی مفہوم ملاحظہ فرمائیے :-

حسن کی بزمِ عشوہ میں شمعِ وفا تھی ضوفگن
عشق کی بارگاہ میں زمزمہ باریاب تھا
معرکۂ عظیم تھا ناز میں اور نیاز میں
زلف بنی تھی برہمی، دل کو بھی پیچ و تاب تھا

کہیں کہیں مصائبِ فراق کا ذکر کرتے کرتے یکبارگی الطافِ دیرینہ کا خیال آجاتا ہے اور استعجاب آمیز انداز میں دریافت کرتا ہے :-

بجھ گیا مہر کا فانوس کہ روشن ہے ابھی؟
اب ان آنکھوں میں لگاوٹ کا اثر ہے کہ نہیں؟
اب مرے نام کا پڑھتا ہے وظیفہ کوئی؟
اب مرا ذکر وفا وردِ سحر ہے کہ نہیں؟
اب بھی تکتی ہیں مری راہ وہ کافر آنکھیں؟
اب بھی دزدیدہ نظر جانبِ در ہے کہ نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ بعض مواقع پر استفہامیہ انداز نسبتاً زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ محبوب کے الطاف و احسانات گن گن کر اُس کی موجودہ روش پر ملامت کرنے کی بجائے یہ بہتر اور زیادہ کارگر طریقہ ہے کہ ایک ادائے متعجبانہ کے ساتھ یوں استفسار کیا جائے کہ :-

اے یارِ دلنشیں! وہ ادا کون لے گیا؟
تیرے نگیں سے نقشِ وفا کون لے گیا؟
راتوں کو مانگتا تھا دعا میری دید کی!
وہ منتیں، وہ ذوقِ دعا کون لے گیا؟
پہلی سی وہ مزاج میں نرمی نہیں رہی
گفتار سے مزاجِ صبا کون لے گیا؟

اعتراضات

یہاں تک ہم نے جوش کے محاسن سے بحث کی ہے اور ان پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے۔ غالباً بلکہ یقیناً مجھے جوش کی شاعرانہ عظمت و کمال کا جسقدر اعتراف ہے اتنا بہت کم حضرات کو ہوگا لیکن انصاف اس امر کا متقاضی ہے کہ جس طرح اُس کے کلام کی مستحسن صفات بیان کرنے میں کسی بخل سے نہیں کام لیا گیا ہے، اُس کے معائب کے اظہار سے بھی گریز نہ کیا جائے۔ اغلاط و اقسام کا پایا جانا تقاضائے بشریت ہے۔ اسی طرح ہم جوش کو بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں متصور کرتے اور اس کے کلام میں بھی غلطیاں پائی جاتی ہیں یہ غلطیاں مختلف النوع ہیں۔ میں نے ان کو تین عنوانات کے تحت میں تقسیم کیا ہے۔ ۱۔ فنی۔ ۲۔ لسانی۔ ۳۔ معنوی

فنی غلطیاں

اس کے ماتحت وہ تمام عیوب آجاتے ہیں جو قواعدِ شاعری سے گریز کرنے کے باعث جناب جوشؔ سے سرزد ہوئے ہیں۔ دو بے اعتدالیاں علی الخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ (۱) ایطاء (۲) رعایت لفظی۔

ایطاء ایطاء کے لغوی معنی ہیں "پامال کرنا"، لیکن اصطلاح شاعری میں ایک ہی قافیہ کو مکرر نظم کر دینے کو "ایطاء" کہتے ہیں۔ دراصل یہ ایک نہایت ہی عامیانہ غلطی ہے اور کاملین فن نے ہمیشہ اس سے احتراز کیا ہے۔ عہدِ جدید میں بعض حضرات اس کے جواز کے قایل ہیں۔ واقعۃ الامر یہ ہے کہ ایطاء نہ صرف اُصولاً ناجایز ہے بلکہ مذاقِ سلیم پر ناگوار گزرتا ہے۔ ایک ہی لفظ کو بالتکرار قافیہ نظم کرنے سے سامعین کی طبیعت کو یکسانیت کوفت سی محسوس ہوتی ہے۔ جوشؔ کے یہاں اس کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں اور ان میں سے بعض تو بے حد مبتذلانہ ہیں۔ ذرا سی توجہ سے رفع کی جا سکتی تھیں۔ ملاحظہ ہو:—

۱۔ کب شیشۂ دل گردشِ تکدّر کے لئے ہے — ہر رنج میں آرام بہادر کے لئے ہے
۲۔ مفت میں بیٹھے بٹھائے خون رُلواتے ہو کیوں — اب ان اُجڑی صحبتوں کی یاد دلواتے ہو کیوں
۳۔ قوم میں ہیں جو کمتر و برتر — ان پہ چھا جائے میرا چھوٹا ستر
۴۔ اک قصرِ قریب رودِ جمنا — لہروں کو بنا رہا ہے بینا
۵۔ ذکر ہوتا ہے مرا پُرہول پیکاروں کے ساتھ — ذہن میں آتی ہوں تلواروں کی جھنکاروں کے ساتھ
۶۔ شحنۂ سلطاں کے دل میں گرم ہو داغِ سراغ — جل رہے ہیں دھندلے دھندلے طاقِ سازش میں چراغ
۷۔ سامنے اک نمایشی دیوار — محوِ تسبیح تھا بصد پندار
۸۔ علم سے ہر چند تجھ کو کم کیا ہے بہرہ مند — لیکن اس سے ہو نہ اے معصوم عورت، دردمند
۹۔ روشنائی میں کہیں گھلتی ہے موجِ ماہتاب — یا کوئی اوراقِ گل پر طبع کرتا ہے کتاب
۱۰۔ جامِ زریں کی کھنک گم ہو گئی گفتار سے — ابر کی سی شوخیاں جاتی رہیں رفتار سے
۱۱۔ سرنگوں ہیں پھول سکتے میں ہے پیمانے کا رنگ — اف یہ نم آلود رخساروں پہ شرمانے کا رنگ
۱۲۔ ہوائیں چل رہی ہیں سنسناتی — مہکتی، سرسراتی، گنگناتی
۱۳۔ شاداب تو ہیں میرے بچپن کی سیر گاہیں — اب ڈھونڈتی ہیں جن کو ترسی ہوئی نگاہیں
۱۴۔ گلے گزر چکے ہیں سبزہ پڑا ہے روندا — کیا کیا مہک رہا ہے پھولا ہوا کھروندا
۱۵۔ تھی تو کہنے کو خموشی عالمِ ذرات میں — لیکن ایسی جیسے رن بولے اندھیری رات میں
۱۶۔ بے تعارف بھی کہن سال مسلماں اب تک — آتے ہی روبرو میرے مجھے کرتے ہیں سلام
۱۷۔ سخت حیراں ہوں کہ اس مشقِ گنہ کے باوصف — ثبت اب تک ہے مری شکل پہ مہرِ اسلام
۱۸۔ اُڑا ہوا ہے رخِ شانِ خسروانہ کا رنگ — قضا کے سایے میں ہے تازہ افسردہ رنگ

۱۸- ہم حباب آسا ہیں لازم ہے کہ جب ہم سے ملو — دوستو، باریک بینی سے خدارا کام لو

۱۹- اس طرف ہڈیوں سے جامۂ تار — اس طرف حجم جُبّہ و دستار

۲۰- پھول چڑھتے ہیں خار زاروں پر — سجدے ہوتے ہیں یاں مزاروں پر

۲۱- دے مرے رُخ کو صولتِ الہام — اور مریدوں کو تحفۂ اوہام

۲۲- اُن کے آگے ہر نیا میدان ہوگا جلوہ گاہ — اور ترا اسٹیج ہوگا صرف شوہر کی نگاہ

۲۳- ان کی راتیں خوف رسوائی سے ہونگی جب دراز — تیرے سینے میں کسی شب کا نہ ہوگا کوئی راز

رعایت لفظی تقریباً ایک صدی پیشتر تک شعر کی بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی تھی کہ کسی طرح کھینچ تان کر اس میں "صنعتِ ایہام" کی گنجایش نکل آئے۔ دراصل یہ تمام تکلفات بارہ فارسی شاعری نے مستعار لئے گئے تھے اور ہماری متعلمانہ ذہنیت کا نتیجہ تھے۔ جب اہل زمانہ کے دماغ تہذیبِ جدید سے روشن ہوئے تو مذاقِ شاعری میں بھی انقلاب عظیم وقوع پذیر ہوا۔ لوگوں کو اس امر کا احساس ہونے لگا کہ ایک بات کو صاف اور نیچرل طریقہ سے ادا کرنا نسبتاً اس سے بہتر ہے کہ اُسے پیچیدہ اور متصنع الفاظ کے گورکھ دھندے میں جکڑ دیا جائے اور مطلب بالکل خبط ہو جائے۔ اس ذہنی انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سوسائٹی نے اس قسم کے تمام لایعنی تکلفات کو مسترد کر دیا اور علی الخصوص "رعایتِ لفظی" کو متفق الالفاظ ہو کر مردود قرار دیدیا ہے۔ جوش "شاعرِ انقلاب" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس سے یہ توقع تھی کہ چند قدم اور آگے بڑھ کر بعض دیگر رسمی تکلفات کا استیصال کرے گا لیکن نہایت افسوس ہے کہ اس کی شاعری میں بھی بعض جگہ وہی شیخ ناسخ اور میاں امانت کی "رعایتِ لفظی" والی ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے۔ بعض مثالیں نقل کی جاتی ہیں:-

۱- آج تک غالب ہے ان پر وہ رقیبِ روسیاہ — کر چکا ہے زندگی جو میر و مومن کی تباہ

۲- وہ تیری پہلی ملاقات کی رو پہلی رات — اُدھر تھا چاند اِدھر دیدۂ پر آب ترا

۳- اشکِ بے سوزِ دروں پانی ہے ایماں کی قسم — قلبِ شبنم پر شعاعِ مہرِ تاباں کی قسم

۴- غم کے سکّے بہرِ زر تا کے بٹھائے جائیں گے — کب تک آخر ہم پہ عشرت رُلائے جائینگے
دامنِ پر تا چند یوں دانے گرائے جائیں گے — آنسوؤں سے تا کجا موتی بنائے جائینگے

۵- ہر اک صدف ہے آنکھ میں آنسو بھرے ہوئے — یارب نزولِ قطرۂ نیساں کا واسطہ

۶- نہ ہوگا کوئی مجھ سا بھی تیرہ قسمت — کہ بازارِ شب میں سحر بیچتا ہوں،

رعایت لفظی کی ایک اور خرابی ایک عیب اس سے بھی زیادہ اہم ملاحظہ فرمایئے۔ مناجات، فریاد، نالہ و بکا ایسے مضامین ہیں جن میں خلوص، صدق اور سادگی ہی درحقیقت کلام کی جان ہوتی ہے۔ لیکن جوش ان موضوعوں پر بحث کرتے ہوئے "صنعتِ ایہام" کا لحاظ رکھتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سراسر تصنع مترشح

ہونے لگتا ہے۔ بعض مثالوں سے یہ مطلب واضح ہو جائے گا

ایک نظم کا عنوان ہے "التجائے مرگ"، یہاں شاعر نے بارگاہ ایزدی میں مرگ کی درخواست کی ہے۔ مطلع ہے:-

کر قطع نخل عمر گلستاں کا واسطہ! یارب بہارِ عالم امکاں کا واسطہ

تمام نظم میں مختلف اشیاء کا واسطہ دیکر خداوند عالم سے درخواست کی ہے کہ مجھے جلد از جلد موت آجائے لیکن ذرا اشعارِ ذیل بھی ملاحظہ فرمایئے:-

کام و دہن کو موت کی تلخی سے کر دوچار شکر فشانیِ لبِ خوباں کا واسطہ
اب طولِ زندگی سے مجھے کر نہ شرمسار بالیدگیِ زلفِ پریشاں کا واسطہ
دے ردِ نسخۂ زیست کو اب حکمِ اختصار تجھ کو درازیِ شبِ ہجراں کا واسطہ
اب نشۂ حیات سے دے جوشؔ کو فراغ تجھ کو خمارِ نرگسِ جاناں کا واسطہ
چھلکا مری جبیں پہ عرق کر سبو نزع کا رنگیں رخوں کی تابشِ افشاں کا واسطہ
اب فکرِ زندگی سے فراغت کی دے نوید شیریں لبوں کی سستیِ پیماں کا واسطہ

یہ وہ موقع ہے کہ جناب جوشؔ رب العالمین سے التجائے مرگ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ التجا کرنے میں حرف حرف سے خلوص و صدق کی بو آنی چاہئے لیکن اس نظم کو پڑھتے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر کی نظر بجائے مناجات کے "رعایت لفظی" پر مرکوز ہے اور شروع سے آخر تک اس صنعت ہی کا لحاظ رکھے ہوئے ہے، دعا کا زیادہ خیال نہیں۔

ایک دوسری خرابی

انگریزی کی ایک مثل ہے کہ کسی ایک جرم کے مرتکب ہونے کے معنی بالفاظ دیگر یہ ہوتے ہیں کہ دیگر مختلف النوع جرائم کا ارتکاب کرنا پڑے گا۔ بعینہٖ یہی حال اس جگہ ہے۔ رعایت لفظی کے چکر میں پڑ کر ہمارے شاعر سے دیگر اہم فنی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ جن کی طرف اشارہ کر لینا لازمی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس تمام مناجات کا مخاطب خدا ہے۔ آپ جب کسی سے اپنے حوائج کی تکمیل کے لئے ملتجی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ کسی شے کا واسطہ دیں تو آپ کی لیاقت و فرزانگی کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ ایسی اشیاء کو واسطہ قرار دیں جن کا شخص مذکور پر نسبتہً زیادہ اثر ہو اور جن کی سفارشات کو رد کرتے ہوئے اُس کو جھجک محسوس ہو۔ یہاں خداوند عالم سے درخواست مرگ کی جا رہی ہے اُصولاً کچھ ایسی چیزوں کا واسطہ دینا چاہئے جو بارگاہ ایزدی میں مقبول و پسندیدہ متصور کی جاتی ہوں لیکن جناب جوشؔ کن اشیاء کو واسطہ قرار دیتے ہیں؟ "شکر فشانیِ لبِ خوباں"، "بالیدگیِ زلفِ پریشاں"، "درازیِ شبِ ہجراں"، "رنگیں رخوں کی تابشِ افشاں" اور ان سب سے زیادہ دلچسپ "شیریں لبوں کی سستیِ پیماں" اور "مست انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں" کا واسطہ ہے۔ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ خداوند عالم کو ان اشیاء کا واسطہ دینا فنی اعتبار سے کہاں تک صحیح ہے اور اس نظم سے کس حد تک بروئے اخلاص آتی ہے!!

"آرزوئے محروم" جوش کی مشہور نظم ہے جس میں انھوں نے اپنے محبوب سے ہجر و مفارقت کا شکوہ کیا ہے شروع یوں کیا ہے

فریاد ہے اے خلوتی پردۂ ناموس — کب سے ہوں تری دھن میں گریبان دریدہ

ماہرین نفسیات اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کسقدر نازک موقع ہے۔ محبوب کی جناب میں فریاد و التجا کی جارہی ہے۔ اپنا افسانۂ دل موثر ترین الفاظ میں پیش کرنا چاہئے۔ ہر لفظ سے خلوص و صداقت ٹپکنا چاہئے، بس یہ معلوم ہو کہ فریاد کرنے والا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اپنے دل کی کیفیات سادہ ترین الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔ لیکن جوش صاحب کا رنگین قلم یہاں بھی "صنعت لفظی" سے نہیں چوکتا اور فرماتے ہیں:۔

سونے کو ترستی ہیں برستی ہوئی آنکھیں — بیدار ہو اے ترک محبت نخشیدہ
وہ سجدہ کروں سر ہی نہیں روح بھی جھک جائے — دے اذن اگر جنبش ابروئے خمیدہ

ہر شعر ایک خاص کیفیت کے ماتحت لکھا جاتا ہے کبھی دل کو فرحت ہوتی ہے اور کبھی کلفت و افسردگی۔ لہذا شعر بھی ان مختلف کیفیات کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ جوش کی ایک نظم کا پہلا مصرع ہے:۔ "اے یار دلنشیں، وہ ادا کون لے گیا" ظاہر ہے کہ یہ نظم عالم ہجر میں لکھی گئی ہے۔ محبوب کی دیرینہ عنایات یاد دلا کر اس کی موجودہ بے اعتنائی پر ملامت کی جارہی ہے۔ اس لئے اس میں بجز درد و مصیبت کی مخلصانہ کیفیات کے اور کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن بھلا کیا مجال کہ جوش صاحب "رعایت لفظی" کا لحاظ نہ رکھیں۔ چنانچہ رقمطراز ہیں:۔

اب جوش کے لئے ہیں نہ آنسو نہ آہ سرد — اس گلستاں کی آب و ہوا کون لے گیا؟

لسانی غلطیاں

عموماً جوش کا کلام لسانی نقطۂ نظر سے مستحسن اور مرجح سمجھا جاتا ہے لیکن یہ امر نہایت تعجب خیز ہے کہ وہ لسانی اغلاط سے بھی خالی نہیں بلکہ بعض غلطیاں تو ایسی ہیں کہ جوش جیسے عظیم المرتبت شاعر کے شایان شان نہیں۔ یہ غلطیاں کئی قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ غلطیاں ہیں جو جوش نے عربی و فارسی سے کامل واقفیت نہ ہونے کے باعث کی ہیں مثلاً:۔

(۱) ایک نظم کا مطلع ہے:۔

اے نرگس جاناں یہ نظر کس کے لئے ہے؟ — یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے؟

پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

اے سایۂ کاکل میں جھمکتے ہوئے عارض! — ظلمات میں یہ آب خضر کس کے لئے ہے؟
اے گیسوئے آشفتہ و اے کاکل برہم — یہ عمر مسیحا و خضر کس کے لئے ہے؟

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

اس راستے کی شمع ہو روح الامیں کی سانس — روشن کبھی ہوا نہ چراغ خضر یہاں (قافیہ نظر و سحر)

خضر بکسر خا و سکون ضاد بروزنِ عشق، یا بفتح خا و کسر ضاد بروزنِ نخجل ہے۔ خضر بروزنِ شُتر یا خضر بروزنِ علل اُردو جہلا کا تلفظ ہے اور قبیح ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ تینوں جگہ بترکیب فارسی استعمال کیا ہے جو سراسر غلط ہے۔

(۲) ایک نظم کا پہلا مصرع ہے:۔ "یہ کس نے جوش کو بھیجے ہیں ناز پرور پھول" قوافی میں سخنور، معتبر وغیرہ پھر لکھتے ہیں:۔

پلٹ کے اے خلش نوکِ خار کے شاکی اسے بھی دیکھ جسے ڈس رہے ہیں کافر پھول

"کافر" بفتحِ خا نہ صرف غلط ہے بلکہ نہایت بھونڈا معلوم ہوتا ہے

(۳) سخت حیراں ہوں مگر اے اُمتِ بدر و حُنین دینوی تصویرِ غم کا شیشہ ہو خونِ حسین

"امتِ بدر و حنین" سے کیا مراد ہے؟ بدر اور حنین دو مقامات کے نام ہیں جہاں غزوات وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ انکی امت سے کیا مفہوم ہے؟ جناب رسالتمآب صلعم یا حضرت علی کو "فاتح بدر و حنین" یا "شاہِ بدر و حنین" البتہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس نسبت سے مسلمانوں کو صرف "امتِ بدر و حنین" کہنا کسی طرح درست نہیں

(۴) توبہ توبہ، فصلِ گل میں اور میں توبہ کروں میں کوئی کافر نہیں الحمدُ ربِّ العالمین

"الحمدللہ" یا "الحمد لربِّ العالمین" کی بجائے "الحمدُ ربِّ العالمین" کہنا صحیح نہیں۔

(۵) "سوگوارانِ حُسین سے خطاب":۔

ابنِ کوثر پہلے اپنی تشنہ کامی کو تو دیکھ اپنے ماتھے کی ذرا مہرِ غلامی کو تو دیکھ!

جناب رسول خدا صلعم کو (یا حضرت علی مرتضیٰ کو) ساقیِ کوثر کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اسی لحاظ سے امام حسین کو علی الخصوص "ابنِ ساقیِ کوثر" کہتے ہیں بنظرِ تعمیم ہر سید کو "ابنِ ساقیِ کوثر" کہہ سکتے ہیں۔ "ابنِ کوثر" کوئی معنی نہیں رکھتا۔

دوسری قسم کی غلطیاں وہ ہیں جہاں جوش نے اُردو الفاظ کو روزمرہ کے خلاف یا غلط استعمال کیا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) کون بہتر ہے ایزدِ باری ان کا تقویٰ کہ میری میخواری

"تقویٰ" اور "میخواری" غیر ذی روح اشیا ہیں۔ ان کے لئے "کون" کہنا غلط ہے "کیا" ہونا چاہئے۔ استفہامیہ ضمیر جب کسی غیر ذی روح کے لئے تنہا استعمال کی جائے (یعنی اس کے بعد کوئی اسم نہ ہو) تو "کون" نہیں کہتے بلکہ "کیا" کہتے ہیں۔ مثلاً ہم کہیں گے "اخبار یا رسالہ؟ کیا پڑھنا چاہئے؟" برخلاف اس کے ذی روح کے لئے کہیں گے "زید اور عمر میں کون زیادہ تیز ہے"

(۲) بیجا نہیں دل کا محو ہونا کلیاں ہیں سفید، سبز دونا

دُونا بروزن ہونا غلط ہے۔ صحیح لفظ دونا بفتحِ دال ہے۔

(۳) "وقفۂ حاضر کو تاجِ زرنگار چمکنے کے بعد"۔ تاج پہنا یا نہیں جاتا۔ اُڑھایا جاتا ہے۔ لباس وغیرہ پہنتے ہیں۔ تاج و کلاہ اُوڑھتے ہیں۔

(۴) "روندتے ہیں جس کو چپائے جھلستی ہے سموم"۔ "جھلسنا" فعل لازم ہے۔ یہاں اس کا محل نہیں۔ اس کی بجائے "جھلسانا" ہونا چاہئے جو فعل متعدی ہے۔

(۵) کون یہ اوڑھے کفن، تا حشر سونے کے لئے جا رہا ہے قبر کی خوراک ہونے کے لئے

موت ہے خوراک میری، موت پر جیتی ہوں میں

اُردو میں خوراک بروزن "سُراغ" مستعمل ہے۔ بروزنِ "طومار" خلافِ روزمرہ ہے۔

(۶) وہ مرحمت میں غرق بڑھی بوڑھیوں کی ذات وہ کاٹنا ڈلی کا کہانی کے ساتھ ساتھ

ذات اور ساتھ ہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔

افراقِ محاورہ محاورات جس طرح روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کئے جاتے ہیں اگر بعینہٖ اسی طرح نظم کئے جائیں تب ہی صحیح مانے جا سکتے ہیں۔ ورنہ اس کو ہم محاورہ نہیں کہہ سکتے۔ بعض مقامات پر جناب جوشؔ اس امر کا بھی لحاظ نہیں رکھتے اور ایک محاورہ کو دو ٹکڑے کر کے بالفصل نظم کرتے ہیں جو غلط ہے۔ مثلاً "چال ڈھال" محاورہ ہے۔ جوشؔ صاحب لکھتے ہیں:۔

۱۔ چال انگریزی، ڈھال انگریزی جسم کا بال بال انگریزی!

بھول چوک ہونا روزمرہ کا محاورہ ہے۔ جناب جوشؔ لکھتے ہیں:۔

اک بے پناہ چوک ہے اک سخت بھول ہے (وفاق)

غیر مانوس الفاظ و تراکیب بعض مقامات پر اس قسم کے غیر مانوس الفاظ لے آتے ہیں جن سے تصنع ظاہر ہوتا ہے اور پڑھنے والے کو کوفت ہونے لگتی ہے۔ مثلاً:۔

۱۔ تو کہے دریا میں تھا غرقِ نمو یار کی کڑیل جوانی کا لہو،

تو یہ کہے کہ ہوش میں دنیا نہیں ہے آج

یہ دراصل "تو گوئی" کا ترجمہ ہے لیکن فی زمانہ نہ صرف متروک ہے بلکہ مذاقِ سلیم کو ناگوار گزرتا ہے۔

یزداں شکار (۱) نگاہ رو برد! اے روحِ نعمت دارین بہوش باش، کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

(۲) ہر بات ایک افسوں، ہر سانس ایک جادو قدسی فریب مژگاں، یزداں شکار گیسو

(۳) چٹکی سے چھوڑ ناوکِ ہستی شکار کو، مست انکھڑیوں کی جنبش مژگاں کا واسطہ

(۴) ظرفِ گلی میں آبِ وضو دیکھتا ہے کیا، آ، جامِ زر میں آتشِ دانا شکار دیکھ

(۵) تجھ سے آتا تھا پسینہ افسر و اورنگ کو اے کہ ہمت تھی تری قوت شکن، دانا شکار

"یزداں شکار" پر رسالہ نگار میں نیازؔ صاحب اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مابین کافی بحث ہو چکی ہے۔ جناب نیازؔ فتحپوری

کا خیال تھا کہ اس کے معنی ہیں "شکار ریزداں"۔ لیکن ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بالاسناد ثابت کر دکھایا کہ شکار کلمۂ فاعلی ہے لہٰذا اس کے معنے ہوئے "یزداں کو شکار کرنے والا"۔ حقیقتاً شادانی ہی کا خیال ٹھیک تھا۔ شکار کلمۂ فاعلی ہے۔ رومی:۔

بہ زیر کنگرۂ کبریاش مردانند فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

لیکن اس سے غالباً عندلیب شادانی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ یہ تراکیب اُردو میں بالکل اجنبی اور غیر فصیح ہیں اور حقیقتاً "فصاحت شکار" ہیں

دیگر غیر فصیح الفاظ

اس کے علاوہ بھی مذکورۂ ذیل اشعار میں خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمائیے کہ کس قدر تصنع سے لبریز ہیں اور خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ یہ الفاظ و تراکیب ہماری زبان میں کس حد تک فصیح ہیں:۔

۱۔ یاد کر وہ دن بمرگِ جوش، جب راز و نیاز دورِ سوز و ساز میں تھے ترجمانِ یکدگر

۲۔ غور کر تو اک عفونت خیز لاشا تو نہیں،

۳۔ ہر جنبش نگاہ ہے اک انقطاعِ فصل

۴۔ کندہ ہے اس ظرفِ شکستہ پہ یارب کس کا نام

۵۔ صدائے نے سے پریشاں تھے شیرِ وانِ جہاں لوائے مہر سے لرزاں تھے قاطعانِ طریق

تضادِ بیان

قرآن مجید میں شعراء کے متعلق مرقوم ہے کہ "انہم فی کل وادٍ یہیمون" یعنی وہ مختلف وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کم از کم جوش کے بارے میں بعض جگہ یہی قول صادق آتا ہے۔ ایک مقام پر خود بھی اعتراف کیا ہے:۔

گونجی ہوئی ازل سے ہے گلبانگ بیخودی یعنی حدیثِ عقل نہیں معتبر یہاں

لیکن ایک وہ شخص جو مستقل فلسفۂ حیات پیش کرنے کا دعویٰ رکھتا ہو جس کا ادعا ہو کہ شاعرِ حقیقت میں وہ ہو سکتا ہے:۔

جس کا دل ہو درِ حقیقت وہ رصدگاہِ عظیم جو ہو فطرت کی ہر اک کروٹ کا ہم راز و ندیم

اُس کے کلام میں قدم قدم پر تضاد و تناقض پایا جانا فی الحقیقت استعجاب انگیز ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ بعض جگہ ایک ہی نظم میں دو متناقض یا غیر مربوط بیانات نظم کر دئے گئے ہیں۔ بعض مثالیں تحریر کی جاتی ہیں۔ "پہلی مفارقت" جوش کی نہایت مقبول نظم ہے۔ اُس کو اس طرح شروع کیا ہے:۔

چاند سے عہدِ وصل کی باتیں ہائے فرقت کی چاندنی راتیں
کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے رات بھر دل میں درد ہوتا ہے
کچھ وہ تکیوں سے آتی ہے خوشبو نیند آتی نہیں کسی پہلو

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

مُرغ جب صبح کو جگاتے ہیں چونکتے ہی وہ یاد آتے ہیں

دیکھئے: شروع میں تو لکھا ہے کہ "کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے" اور "نیند آتی نہیں کسی پہلو" لیکن پھر اس کے کیا معنی ہوتے ہیں کہ "مرغ جب صبح کو جگاتے ہیں" "چونکتے ہی الخ" بھلا جب نیند آتی ہی نہیں اور شب کو سوتے ہی نہیں تو مرغ جگاتے کیونکر ہیں؟ اور ایک "شب بیدار" کا خواب سے چونکنا کیا معنی رکھتا ہے؟

۲- ایک نظم کی ابتدایوں کی ہے:-

اے نرگسِ جاناں یہ نظر کس کے لئے ہے؟ یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے؟

جس میں چشمِ محبوب کے شعلہ، بجلی، شرر پر زور دیتے ہوئے ایک نہایت ہی خوفناک اور مہیب شے ثابت کیا ہے لیکن پھر لکھتے ہیں:-

اے دیدۂ مے پرور و اے نرگسِ مخمور چھلکا ہوا یہ ساغرِ زر کس کے لئے ہے

یہاں نہایت مناسب اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے قبل تو شعلہ، بجلی اور شرر سب ہی کچھ محبوب کی نگاہ سے ٹپک رہے تھے لیکن یکایک وہی نگاہ "مے پرور" اور "مخمور" کیسے ہو گئی۔

۳- ایک نظم کا مطلع ہے:-

ہنوز عشق و محبت کی شان باقی ہے وہی زمین وہی آسمان باقی ہے

جس سے مستنبط ہوتا ہے کہ عشق و محبت کی گزشتہ کیفیات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے۔ لیکن بعد میں تحریر فرماتے ہیں:-

جفا کا اب نہیں اگلا سا بانکپن قایم مگر وفا کی وہی آن بان باقی ہے
وہ جوش چھوڑ چکے ناوک افگنی پھر بھی چمکتا تیر، لچکتی کمان باقی ہے

بالفاظ دیگر، محبوب نے اپنا گزشتہ رویہ بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ اس سے پیشتر وہ جفائے شدید کیا کرتا تھا (جو غالباً عاشق کے لئے لذت بخش تھی) لیکن اب اس نے اس روش سے قطعاً کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ ذرا ان اشعار کو مطلع مذکور (ہنوز عشق الخ) سے منطبق کیجئے اور ملاحظہ کیجئے کہ معانی میں کس قدر زبردست تناقص ہے۔ وہاں لکھا ہے کہ حالات بدستور ہیں لیکن ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب نے اپنا گزشتہ رویہ بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ دلچسپ شعر یہ ہے:-

وہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے مدت سے یہاں جفا پہ وفا کا گمان باقی ہے

اعتراض یہ ہے کہ ابھی تو فرما چکے ہیں کہ "جفا کا اب نہیں اگلا سا بانکپن قایم" اور محبوب نے ناوک افگنی چھوڑ دی ہے یعنی ظلم نہیں کرتا لیکن اب کہتے ہیں کہ "وہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے مدت سے"۔ کیا یہ تعجب خیز تضاد نہیں ہے؟

اب ہم ان تناقص بیانات کی جانب اشارہ کریں گے جو ایک ہی نظم میں تو نہیں لیکن مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں بحقیقتاً یہ بھی اسی قدر قبیح ہے۔ جو شاعر ایک مستقل پیام کا مدعی ہو اس کو لازم ہے کہ جس جگہ کوئی بات کہے اپنا اصول مدنظر رکھے ورنہ شاعری کے مخالفین کہہ اٹھیں گے کہ "دروغ گو را حافظہ نہ باشد" بہرحال وہ متضاد اور غیر مربوط بیانات یہ ہیں:-

۱۔ مومنانِ لکھنؤ سے خطاب فرماتے ہیں:۔

ممبرِ سبطِ نبی پر اور سیاسی شور و شین — مجھ سے آنکھیں تو ملاؤ سوگوارانِ حسین

یعنی مجالسِ عزا میں سیاسی مسایل پر مباحثہ و مناظرہ کرنا جوشؔ کے زاویۂ نگاہ کے مطابق مکروہ اور قبیح ہے لیکن جوشؔ کا ایک سلام ہے (جو یقیناً مجالس عزا میں پڑھنے کے لئے ہی لکھا جاتا ہے) اس میں فرماتے ہیں:۔

بستۂ زنجیر محکومی خبر بھی ہے تجھے — مہر و مہ پر تجھ کو عزمِ حکمرانی چاہئے

کوئی پوچھے کہ یہ سب "سیاسی شور و شین" نہیں تو اور کیا ہے؟

۲۔ ایک جگہ عاشقانہ وقار و خودداری کی تصویر یوں پیش کی ہے:۔

میرے جلسے سے اُٹھ آنے پر خفا ہو ہمنشیں! — شاعروں کی فطرتِ عالی سے تو واقف نہیں؟
دل ہمارا جذبۂ غیرت کو کھو سکتا نہیں، — ہم کسی کے سامنے جھک جائیں ہو سکتا نہیں

اہلِ دنیا کیا ہیں اور اُن کا اثر کیا چیز ہے؟
ہم خدا سے ناز کرتے ہیں بشر کیا چیز ہے؟

اسی طرح ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

کیا دیکھتا ہے زُہد کے کوچے میں رعبِ شیخ — کوئے مغاں میں جوشؔ کا عز و وقار دیکھ!

پڑھنے والا اس "فطرتِ عالی" اور "عز و وقار" سے بیحد مرعوب ہو جاتا ہے کہ "دل ہمارا جذبۂ غیرت کو کھو سکتا نہیں" لیکن بعض دوسرے مقامات پر اس "فطرتِ عالی" کا مظاہرہ اس طرح کیا گیا ہے (خط کشیدہ جملے قابلِ لحاظ ہیں:۔

مزاج پوچھ کے اے شاہِ عارض و کاکل — گدائے راہ کی بھی آبرو بڑھاتا جا
اگر یہ لطف گوارا نہیں، تو مستِ خرام — جبینِ جوشؔ پہ ٹھوکر ہی اک لگاتا جا
پھر آرزوئے شرکتِ بزمِ جمال ہے — پھر اہتمامِ خدمتِ دربان ہے آجکل

بعض دیگر معنوی غلطیاں ملاحظہ فرمایئے:۔

دیکھ کیونکر جی رہا ہوں دلربا تیرے لئے! — ہر نفس ہے اک حدیثِ کربلا تیرے لئے
ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں — پوچھتا پھرتا ہوں میں اپنا پتا تیرے لئے

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتہائی کرب و اضطراب کا عالم ہے اور ساتھ ہی ساتھ مدہوشی، بدحواسی اور خود فراموشی کی یہ کیفیت ہے کہ اپنا پتہ معلوم نہیں۔ لیکن پھر فرماتے ہیں:۔

آہ، گو اک عمر سے ہوں میں رئیسِ ابنِ رئیس — بن کے نکلا ہوں گدائے بے نوا تیرے لئے
چاک کر کے میں نے آبائی امارت کا لباس — زیبِ تن کی ہے غلامی کی قبا تیرے لئے

یہاں نہایت ہی برمحل اور معقول اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ ایک عاشق جو بیحد مضطرب اور بیچین ہے اور جس کی مدہوشی اور خود فراموشی کا یہ عالم ہے کہ اپنا پتہ بھی دوسروں سے پوچھتا پھرتا ہے اس کے متعلق یہ کہنا قطعاً خلافِ واقعیت ہے کہ وہ دعویٰ کرتا ہوگا کہ "میں رئیس ابنِ رئیس ہوں" اور "میری آبائی امارت چُنیں اور چُناں تھی"، ہر وہ شخص جو نفسیاتِ انسانی سے واقفیت رکھتا ہے دل میں فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ سب کس حد تک ہے !! مولانا جامی نے صحیح کہا ہے :-

بندۂ عشق شدی، ترکِ نسب کن جامی — کیں دریں راہ فُلاں ابنِ فُلاں چیزے نیست!

بعض مقامات پر بیان نہایت غیر مربوط ہے مثلاً :-

(۱) اے نرگسِ جاناں یہ نظر کس کے لئے ہے؟ — یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے؟
اے زہرہ جبینوں کے لئے پیکِ ہزیمت — پیغامبرِ فتح وظفر کس کے لئے ہے
اے تجھ کو ملے عمرِ مری شامِ بلا کی — یہ زلفِ رسا تابہ کمر کس کے لئے ہے

شروع میں ظاہر ہوتا ہے کہ نرگسِ جاناں (یعنی چشمِ محبوب) سے خطاب کیا جارہا ہے۔ لیکن تیسرا شعر بھی ملاحظہ فرمائیے کہ (اے تجھ کو ملے عمر الخ) اور غور فرمائیے کہ چشمِ محبوب کو یہ دعا دینا کس حد تک مناسب ہے۔ دراصل اس مصرع کا مخاطب خود محبوب ہے لیکن اس تبدیلیِ تخاطب کی تصریح لازمی تھی جو یہاں نہیں کی گئی ہے۔ یہ خامی جوش کی متعدد نظموں میں پائی جاتی ہے:-

(۲) کیونکر نہ کروں شکرِ خدائے دو جہاں کا — بخشا ہے مرے دل کو مزہ سوزِ نہاں کا
یکساں ہے مسرت کا محل ہو کہ فغاں کا — ہو نارِ جہنم بھی تو لطف آئے جناں کا
ہوتی ہے خوشی صحت و آزار سے مجھ کو
خلعت یہ ملا ہے تری سرکار سے مجھ کو (آوازۂ حق)

ابتدا میں خدائے دو جہاں صیغۂ واحد غائب میں ہے۔ لیکن پھر تیسرے مصرع میں "تیری سرکار" سے کیا مراد ہے۔ اگر یہ بھی خدا سے خطاب ہے تو وہی متذکرۂ بالا عیب یہاں بھی موجود ہے یعنی تبدیلیِ تخاطب کی ہے لیکن اس کی تصریح نہیں کی گئی۔

(۳) "مقتل کا پنور" اے سیہ رو، بے حیا، وحشی، کمینے بدگماں — اے جبینِ ارض کے داغ، اے ولی ہندوستاں
تجھ کو عورت نے جنا ہے؟ جھوٹ ہے یہ اے لعیں! — آدمی کی نسل سے اور تو، نہیں ہرگز نہیں!

یہاں مخاطب ہندوستان ہے مگر ہندوستان کو "عورت نے جنا ہے اور "آدمی کی نسل سے تو نہیں"، کہاں تک موافقِ عقل ہے؟ ہندوستان ایک ملک کا نام ہے۔ اس کا نسل آدم سے ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مزید براں لفظ "جنا" نہایت عامیانہ لفظ ہے فصحا کی زبان پر رائج نہیں اور سب سے زیادہ دلچسپ تو یہ مسئلہ ہے کہ ہندوستان کو عورت نے جنا ہے یا نہیں!

تکرار و بے ترتیبیِ بیان | شاعر کا کمال یہ ہے کہ جس شے کا تذکرہ کرے اس کا نقشہ اس طرح پیش کرے کہ آنکھوں

کے سامنے اس کی تصویر من وعن کھنچ جائے۔ تبیینِ کلام میں اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے کہ جو شے نسبتاً زیادہ اہم اور مرجح ہے اس پر خاص زور ڈالا جائے اور غیر ضروری اور لایعنی اُمور کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اسی طرح تقدم اور تاخر کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے، یعنی اول ضروری اور لازمی اشیاء کا ذکر کر دیا جائے بعدہٗ غیر ضروری اور فرعی کا، ساتھ ہی ساتھ اس امر کا بھی خیال رکھنا ازبس لازمی ہے کہ مضامین کا اعادہ و تکرار نہ ہونے پائے۔ جوشؔ کے یہاں بعض نظموں میں یہ باتیں مفقود نظر آتی ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص فنِ تبیین سے ناواقف ہے اور جو شے پیشِ نظر ہے اس کو نہایت بے ترتیبی کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ مثلاً جوشؔ نے "مولوی" کا حلیہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

۱۔ ہوئی اک مولوی سے کل ملاقات — شبیہ قبہ و تصویر منبر
۲۔ وہی ہوں گے جو فردوسِ بریں میں — خدا کے فضل سے حوروں کے شوہر
۳۔ عمامہ بر سر و مسواک در جیب — اُٹھنگا پائجامہ، دلق در بر
۴۔ حنا سے ریش سرخ، آنکھوں میں سرمہ — لٹیں مہکی ہوئیں، زلفیں معطر
۵۔ جھکے شانے پہ چوخانے کا رومال — عبا کے بند میں تسبیح احمر
۶۔ کشادہ صدر اور کوتاہ گردن — شکم پر رعب، قد رشکِ صنوبر
۷۔ لٹیں مہکی ہوئیں، آنکھوں پہ عینک — لبیں ترشی ہوئیں، داڑھی شکم پر
۸۔ عبا عناب گوں داڑھی حمامہ — گلوری منہ میں، لب خونِ کبوتر

یہاں مولوی سے ملاقات کا تذکرہ تو مقصود نہیں۔ محض اس پر تضحیک و استہزا کرنا اور اس کا استخفاف منظور ہے۔ اسی غرض سے اُس کا "حلیۂ عجیب" بیان کیا ہے لیکن ایک نظر غائر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیان میں جابجا بے ترتیبی اور تکرار عیاں ہے۔

سب سے پیشتر آپ "مولوی" کی شکل و شباہت پر غور فرمائیے۔ اس پر نظر پڑتے ہی جوشؔ صاحب کے ذہن میں ایک تشبیہ آئی کہ اس مولوی کا تن و توش قبہ و منبر سے متشابہ ہے۔ اس تشبیہ کا بہترین استعمال یہ ہوتا کہ جب مولوی کا حلیہ بیان کر لیتے تو تاثیرِ کلام کے لئے اس تشبیہ کا بھی اضافہ کر دیتے لیکن جوشؔ صاحب نے سب سے پہلے اس تشبیہ ہی کو نظم کیا ہے جو فنی اعتبار سے بالکل بے محل ہے

پھر اس کی ہیئت کی جو تصویر پیش کی ہے اس میں بھی بعض جگہ بالکل لایعنی اُمور معرضِ بحث میں آ گئے ہیں جو فنِ تبیین کے خلاف ہے۔ مولوی کے جسم و صورت پر بحث کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں یہ کہنا کہ

وہی ہوں گے جو فردوسِ بریں میں — خدا کے فضل سے حوروں کے شوہر

مولوی کے خلاف نفرت و استکراہ اور خشونتِ انتقام کے جذبہ کا البتہ مظہر ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ صرف یہ معلوم

ہوتا ہے کہ شاعر کو اس مولوی سے کوئی خاص عناد ہے اور معاندانہ چشمک کی بنا پر اس کی تذلیل کے درپے ہے۔ وگرنہ اصل مقصد (یعنی مولوی کی شکل و شباہت کی مرقع کشی) سے اس شعر کو کوئی لگاؤ نہیں

اس کے بعد مولوی کا حلیہ بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔ اس کے "فرقِ راس" کے ذکر سے ابتدا کی جاتی ہے اور کہتے ہیں کہ اس کے سر پہ عمامہ تھا۔ اس کے بعد لازم تھا کہ اس کے چہرے وغیرہ کا ذکر کیا جاتا لیکن فوراً ہی "مسواک اور جیب" کہہ کر قارئین کی توجہ جیب کی طرف منعطف کر دی جاتی ہے۔ جیب کے بعد پائجامہ کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ پڑھنے والا منتظر ہے کہ اب جوتے وغیرہ کا ذکر کیا جائے گا۔ لیکن یکایک "بہ ہمہ ادائے بے ترتیبی" مولوی صاحب موصوف کی دلق پوشی پر بحث چھڑ جاتی ہے۔ اصولاً ریش و چشم کا ذکر عمامہ کے بعد فوراً ہی ہو جانا چاہئے تھا جہاں مسواک جیسی لایعنی شے کا بالکل بے محل ذکر کر دیا گیا ہے۔ بہر حال لب شکل و شباہت کی خصوصیات بیان کرتے ہیں کہ سرخ داڑھی، آنکھوں میں سرمہ، معطر گیسو، کاندھے پہ رومال، چوڑا چکلا سینہ، کوتاہ گردن، توندیلا پیٹ وغیرہ وغیرہ

غالباً قارئین سمجھے ہوں گے کہ چہرہ کی خصوصیات بیان کی جا چکیں کیونکہ اب رومال، عبا، تسبیح وغیرہ کا ذکر شروع ہو گیا ہے۔ لیکن نہیں، چشم و گیسو جن پر شعر نمبر ۴ میں "نگاہ مصورانہ" ڈالی جا چکی تھی پھر دوبارہ (نہ معلوم کیوں) تبئین کلام کے دوران میں شعر نمبر ۶ و نمبر ۸ میں جا گزیں ہوتے ہیں۔ اگر گیسوؤں کی مہک کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی "پریشانی" کا بھی ذکر ہو جاتا اور جہاں داڑھی کے "احمریں" ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہیں اس کا شکم پر رعب پر دراز ہونا بھی بیان کر دیتے تو یک گونہ تسلسل اور ترتیب ظاہر ہوتی۔ بصورتِ موجودہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو ترتیب بیان اور تسلسل کا مطلق لحاظ نہیں۔

بعینہٖ اسی طرح عبا، عمامہ اور لبوں کا ذکر شعر نمبر ۳ و نمبر ۵ میں کیا جا چکا ہے جہاں ان اشیاء کی بعض خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اب شعر نمبر ۷ و نمبر ۸ میں مکرر ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس قسم کی بے ترتیبی نہ صرف خلافِ فصاحت ہے بلکہ پڑھنے والے کی کوفت کا باعث ہوتی ہے

شاعرانہ مصوری کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ جہاں کسی شے کا ذکر کیا جائے تو اس کے ساتھ ہی ساتھ اُس کی مابہ الامتیاز خصوصیات کا بھی ذکر کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ تصویر مکمل متصور کی جائے۔ جوشؔ کے یہاں بعض جگہ اس خوبی کا بھی فقدان ہے مثلاً عبا کا ذکر شعر نمبر ۸ میں کیا ہے۔ لیکن اس کے بند میں جو تسبیح آویزاں تھی اس کا شعر نمبر ۵ ہی میں تذکرہ کیا جا چکا۔ گویا ابھی یہ بتایا نہیں کہ وہ عبا کس وضع و قماش کی تھی لیکن اس کے لوازمات میں سے ایک شے کا پیشتر ہی ذکر کر دیا۔ یونہی شعر نمبر ۶ میں لبوں کی کیفیت بیان کی ہے لیکن ریشِ دراز، عبا اور عمامہ کا بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ لب، خونِ کبوتر کی مانند سُرخ بھی تھے۔ اس افتراقِ بیان سے بجز بے ترتیبی کے اور کچھ تو حاصل نہیں ہوا۔ یہ عیب جوشؔ کی موجودہ نظموں میں علی الخصوص پایا جاتا ہے

بھونڈی تشبیہات | تشبیہ کا حُسن اور اس کی لطافت اس نکتہ میں مضمر ہے کہ مشبہ بہ اس قدر نفیس منتخب کیا جائے

جس کے باعث شئے مشبہ لطیف تر ہو جائے اور دنیا کی نگاہ میں اس کا حسن دوبالا ہو جائے۔ جوش کے یہاں بعض جگہ اس نکتہ کو نہیں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور بعض تشبیہات نہایت غیر شاعرانہ اور بھونڈی ہیں۔ مثلاً:-

نرم ہو جاتا ہے پلٹس سے جو یک کر پھوڑا — بیشتر نشتر براح سے ہوتا ہے فگار
فرشِ گل کی یونہی ہو جاتی ہے خوگر جو قوم — ہونا پڑتا ہے اُسے خارِ مغیلاں سے دوچار

پھاڑتے ہی جیسے میلا چیتھڑا اُڑتی ہے گرد — یونہی وہ دو شخص جو ایک دوسرے سے ہیں خفا
گفتگو کرتے ہیں جب آپس میں ازراہِ نفاق — دیکھتا ہوں اُن کے ہونٹوں سے غبار اُڑتا ہوا

صبح کے ہنگام جیسے مدرسے کی گھنٹیاں، — طفل کے ذوقِ شکر خوابی کو کرتی ہیں نڈھال
یونہی بے تاب و تواں بچوں کے مفلس باپ کی — نیند اُڑا دیتا ہے اے خوابِ اجل! تیرا خیال،

اس طرح تیرگی میں ہوتا ہے — خوف کا قلب طفل میں آغاز
جس طرح رات کی خموشی میں، — سائیکل کی اُتار پر آواز

موٹر

جیسے موٹر کی گریزاں روشنی سے راہ میں — نصف لمحے کے لئے ظلمت پہ چھا جاتا ہے نور
سرمدی آلام کے مارے ہوئے انسان کو — یونہی چھو جاتی ہے دم بھر کے لئے موجِ سرود

غبار اک دوسرے پر پھینکتے ہیں تیز رو موٹر — مخالف سمت سے ہمدوش ہو کر جب گزرتے ہیں
یونہی دو بدگہر اشخاص، جب آپس میں ملتے ہیں — نئی تاریکیاں اک دوسرے سے اخذ کرتے ہیں

شاد و فرحاں ہیں نئے احباب تیرے لطف سے — سرد مہری سے قدیم احباب کا رُخ زرد ہے
یہ تری صورت ہوا ایسے تیز رو موٹر کی طرح — جس کے آگے روشنی ہے اور پیچھے گرد ہے

وقتِ شب کچھ اور بھی تاریک کر جاتا ہے یوں — اپنی چمکائی ہوئی ظلمت کو موٹر کا غبار
جس طرح کاندھے پہ رکھ کر ہاتھ دم بھر کو خوشی، — دوش پر غم کا نیا اک اور رکھ جاتی ہے بار

شب کو اک پرسکون محفل کا — آ کے موٹر مٹا گیا یوں ناز
جس طرح آئے وقتِ بادہ کشی — کان میں مے فروش کی آواز

نسائیت

فصاحت کا خاص عنصر یہ ہے کہ مرد و زن، طفل و جوان، شیخ و شباب ہر ایک کی گفتگو نیچرل طریقہ کے مطابق نظم کی جائے تاکہ واقعیت مترشح ہو۔ جوش نے بعض جگہ اس امر کا بھی لحاظ نہیں رکھا ہے۔ اور مرد کی گفتگو نظم کرتے ہوئے نسوانی الفاظ و محاورات استعمال کر گئے ہیں مثلاً:-

۱- تیغ و سناں اور عورت کا گلا، او بدصفات — چھوٹ جائیں تیری نبضیں، ٹوٹ جائیں تیرے ہاتھ
۲- مرد ہو تو اُس سے لڑ پہلے جو مارے پھر مرے — تو نے بچوں کو جبا ڈالا، خدا غارت کرے (مقتل کانپور)

۳- کھائے جاتا ہے کوئی سینے کو آگ لگ جائے ایسے جینے کو (پہلی مفارقت)

خاتمہ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ اس قسم کے تسامحات سے جوش کے کمالات شاعری میں کچھ زیادہ فرق نہیں پیدا ہوتا اس نوع کے اسقام سے کسی شاعر کا کلام خالی نہیں۔ فردوسی سے بڑھکر کون قادر الکلام ہوگا، متاخرین میں قاآنی کا جواب نہیں لیکن ان دونوں کے کلام میں اس قسم کی بے اعتدالیاں کثرت سے ہیں۔ اردو شاعری میں میر انیس کی مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ ان کے مسلمہ کمالات و محاسن کے باوجود، ایک غیر جانبدار نقاد کو ان کا کلام بھی اغلاط سے پاک نہیں نظر آتا۔ یہی حال جوش کا ہے بلکہ اس کے کمالات شاعری بڑی حد تک اس کے اکثر مسامحات کی پردہ پوشی کر لیتے ہیں اور پڑھنے والا ایک خاص استغراق و محویت کی کیفیت محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ وہ اختصاص ہے جو جوش کے اکثر معاصرین میں مفقود ہے۔ دوسرے شعراء تقلید کے دائرے سے باہر نہیں نکلے لیکن جوش کا ایک مخصوص رنگ ہے اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہے:-

مرغانِ خوش آہنگ اندر باغِ سخن لیکن
نالیدنِ ایں بلبل شورِ دگرے دارد

یوسف رضا بدایونی
(ممتاز ہاؤس - علی گڈھ)

(نگار) اس مضمون کی کتابت ہو ہی رہی تھی کہ ڈاک سے ہمیں ایک تحریر موصول ہوئی جس میں یہ نہایت دلدوز خبر درج تھی کہ نوجوان مقالہ نگار دفعتہً ۳ ستمبر کو ریل سے کٹ کر مر گئے

مرحوم مسلم یونیورسٹی کے نہایت ہونہار طالب علم تھے اور حال ہی میں انھوں نے نہایت اعزاز کے ساتھ وہاں سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی — مرحوم کی والدہ پر اس حادثہ سے قبل ہی غم و الم کی خاص کیفیت طاری تھی، اور جسوقت تار پہونچا تو وہ مبہوت ہو کر رہ گئیں۔ یقیناً کوئی اس غم کا اندازہ نہیں کر سکتا جو ماں کو اپنے جوان بیٹے کی ایسی اچانک موت کی وجہ سے پہونچنا چاہئے اور اس پر جتنا اظہار افسوس کیا جائے کم ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ فطرت جس کے پنجے اور دانت ہمیشہ خون سے رنگین رہتے ہیں، سخت بے رحم ہے اور اس کا مقابلہ پتھر کا کلیجہ بنانے ہی سے ہو سکتا ہے

مرحوم کا یہ غالباً پہلا انتقادی مقالہ ہے جو نگار میں شایع ہوا ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوجوان ادیب میں ترقی کے کتنے امکانات پوشیدہ تھے جو افسوس ہے کہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ ہمیں مرحوم کے اعزہ و پسماندگان اور خصوصیت کے ساتھ ان کی سوگوار ماں کے ساتھ دلی ہمدردی ہے لیکن سوائے اس کے کہ صبر و ضبط کی لایعنی تلقین کریں اور کیا کر سکتے ہیں —

"چالیس" کی اہمیت مذاہب عالم میں

"چالیس (۴۰) کے ہندسے کو تمام اقوام و مذاہب میں خاص اہمیت حاصل ہے، چنانچہ مرنے کے بعد چہلم کی رسم، ریاضت و عبادت میں چلہ کشی (یعنی چالیس دن کا اعتکاف)، رسول اللہ کا چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہونا، سورۂ احقاف میں اربعین (۴۰ سال) کا ذکر، ایام نفاس کے لئے ۴۰ دن کی تعیین، یہ وہ تمام باتیں ہیں جن سے ہر مسلمان واقف ہے

اسی طرح یہودیوں کے مذہبی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل ۴۰ سال تک خانماں برباد پھرا کئے ایلیا نبی کو ۴۰ سال تک کوؤں نے غذا پہونچائی، جس بارش سے طوفان نوح پیدا ہوا وہ بھی چالیس دن تک قایم رہی۔ مصر قدیم میں بھی لاش کی مومیائی کے لئے ۴۰ دن کی مدت مقرر تھی اور انگلستان کے عہد وسطی میں بھی قتل انسان کے جرمانہ کی ادائی کے لئے ۴۰ دن کی میعاد مقرر تھی، جنگ کے دوران میں فریقین کو آرام لینے کے لئے ۴۰ ہی دن کا وقت ملتا تھا اور دارالعلوم کے الغوا کے بعد ممبران پارلیمنٹ کو جو مہلت ملتی تھی وہ بھی ۴۰ دن کی ہوتی تھی۔ لیکن ایسا کیوں ہے، دنیا کے تمام اقوام میں ۴۰ کو یہ اہمیت کیوں حاصل ہے اور یہ واقعہ ہماری تحقیق کو ہمیں کس نتیجہ پر پہونچاتا ہے۔ اس پر اسوقت تک کسی نے توجہ نہیں کی۔

یہ تھا وہ معمہ جواب سے تقریباً تیس سال قبل مسٹر ام۔ اس اڈورڈس نے انجمن علم الانسان کے جلسہ میں پیش کیا تھا اور اب مسٹر پربھونے کامل تحقیق و تفتیش کے بعد ایک مقالہ کے ذریعہ سے اس پر روشنی ڈالی ہے

اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰ کی اہمیت مسلمانوں اور یہودیوں کی طرح زرد شتیوں، ہندوؤں اور عیسائیوں میں بھی پائی جاتی ہے اور یقیناً یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ مشرق و مغرب کی اقوام کا استھان کسی وقت ایک ہی تھا اور یہی سبب ہے کہ بعض روایتیں اور قصے کہانیاں ان سب میں مشترک پائی جاتی ہیں

سب سے پہلے آپ توریت کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ:— طوفان نوح لانے والی بارش ۴۰ دن تک جاری رہی۔ طوفان کے ۴۰ دن کے بعد پہاڑ کی چوٹی نظر آئی — یعقوب کی لاش میں مسالہ لگانے کے لئے ۴۰ دن درکار ہوئے۔ موسیٰ ۴۰ دن تک کوہ حوریب پر بھوکے پیاسے پھرتے رہے — موسیٰ نے چالیس چالیس دن کے دور دزے رکھے۔ ایلیا نبی چالیس دن تک بے آب و دانہ رہے — یہوداکے ۴۰ سالہ گناہ کی یاد میں Ezekiel ۴۰ دن تک

داہنی کروٹ سے لیٹے رہے — Goliath نے اسرائیل فوجوں کا ۴۰ دن مقابلہ کیا — نینوا کو توبہ کے لئے ۴۰ دن دئے گئے — لڑکا پیدا ہونے کے بعد ۴۰ دن اور لڑکی پیدا ہونے کے بعد ۸۰ دن نفاس کے مقرر کئے گئے —
کی عمر ۴۰ سال کی تھی جب وہ بطور جاسوس کے روانہ کئے گئے — بنی اسرائیل ۴۰ سال تک جنگلوں میں پھرتے رہے —
بنی اسرائیل کو اہل فلسطین نے ۴۰ سال تک پریشان رکھا — سلیمان، داؤد اور Joash نے ۴۰ سال تک
حکومت کی — یعقوب نے Esau کو ۴۰ گائیں تحفہ میں بھیجیں — اسی طرح کے اور بہت سے واقعات توریت
میں ایسے درج ہیں جن سے ۴۰ کے عدد کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے — زردشت نے ۴۰ سال کے بعد تبلیغ شروع کی۔
۴۰ دن تک مسلسل اہورامزدا کے اسمار کا ورد پارسیوں کے نزدیک بہت مفید خیال کیا جاتا ہے — سال کے ۳۶۰ ایام کو
وہ چلوں میں تقسیم کرتے ہیں اور مذہبی رہنما کو یہ خدمت قبول کرنے سے بھی ۴۰ دن ریاضت کرنا پڑتی ہے
ہندوؤں کے یہاں بھی عورت کے ایام نفاس کے لئے ۴۰ دن مقرر ہیں — سندھ کے ہندوؤں میں رواج ہے کہ بچہ کی
ناف کاٹ کر اسے ۴۰ دن تک ماں کے سرہانے رکھتے ہیں — ویدک طریق علاج میں کایا پلٹ کے لئے ۴۰ دن درکار ہوتے ہیں
شمراد کے چالیسویں دن شمبر سے اندر کی ملاقات ہوئی — عیسوی روایات میں بھی ۴۰ کا ذکر بہ کثرت نظر آتا ہے — مسیح کی ولادت
کے ۴۰ دن بعد مریم نے مسیح کو معبد میں پیش کیا — مسیح نے چالیس دن کا روزہ رکھا — سولی چڑھائے جانے کے بعد مسیح
۴۰ گھنٹے قید میں پڑے رہے — احیاء ثانی کے بعد وہ ۴۰ دن تک اسی زمین پر رہے اور پھر اس کے بعد آسمان پر لیجائے
گئے — شعراء قدیم کے کلام میں بھی ۴۰ کا وجود پایا جاتا ہے اور شیکسپیر کے ڈراموں میں بھی —

ان تمام روایات سے یہ بات تو یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ تمام اقوام عالم کسی زمانہ میں ایک ہی جماعت سے تعلق رکھتی تھیں جو منتشر ہو کر مشرق و مغرب میں پھیل گئی اور بعض روایات بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ کب اور کس حصۂ زمین سے اس جماعت کے افراد ادھر اُدھر منتقل ہوئے اور چالیس کے عدد کو ان کی روایات میں کیوں اتنی اہمیت حاصل ہے — انسان سب سے اول کرۂ زمین کے کس حصہ میں رونما ہوا، اس کے متعلق مختلف نظریے پائے جاتے ہیں اور منجملہ ان کے تلک کا نظریہ یہ ہے کہ عہد قبل تاریخ میں انسان کا سب سے پہلا مسکن وہ تھا جسے اب منطقۂ بارودہ یا قطبین کے پاس کا حصۂ زمین کہتے ہیں — ہر چند یہ نظریہ بظاہر اس لئے غلط معلوم ہوتا ہے کہ قطبین کے منجمد حصہ میں انسان کیونکر پایا جاتا ہوگا لیکن منطقۂ بارودہ کے متعلق جو طبقاتی (Geological) جوی (Meteorological) اور علمی تحقیق گزشتہ ۳۰ سال کے اندر ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر تلک کا یہ نظریہ غلط نہیں ہے۔

اس منطقہ کے متعلق یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کا برفانی یا انجمادی دور کوئی مستقل چیز نہیں تھا، ایک زمانہ انجماد کا آتا تھا اور ختم ہو جاتا تھا اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ اس کا آخری انجماد کب ختم ہوا
علماء طبقات الارض کا بیان ہے کہ سب سے آخری انجماد ۴۰ ہزار اور ۲۰ ہزار سال قبل مسیح کے درمیان پایا

جاتا تھا لیکن اس زمانہ کے دوران میں بھی صدیاں ایسی گزر جاتی تھیں کہ موسم گرم ہو جاتا تھا اور منطقۂ باردہ آبادی کا اہل بن جاتا تھا۔ علاوہ اس کے سب سے بڑا ثبوت سرزمین قطبین کے کسی وقت گرم ہونے کا یہ ہے کہ وہاں لوہے اور کوئلے کی بڑی زبردست معدنیں دریافت ہوئی ہیں۔ حال ہی میں روس کے چار علماء اس منطقہ کی تحقیق کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں پہونچکر انھوں نے یہ لاسلکی پیام بھیجا کہ "قطب شمالی برف سے بالکل خالی نظر آتا ہے اور ہم سردی کے لئے ترس رہے ہیں" تو دنیا حیرت زدہ ہو کر رہگئی ۔۔۔ الغرض یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچ چکا ہے کہ منطقۂ باردہ ہمیشہ برفستانی نہیں رہا ہے اور اس پر گرمی کے دور بارہا گزر چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ علماء حال کی تحقیق یہ بھی ہے کہ انڈو آرین اقوام کا اصلی وطن یہی سرزمین قطب تھی اور بعد کو برفانی دور آنے کی وجہ سے وہ ادھر اُدھر منتقل ہوئیں۔ بہرحال یہ تسلیم کر لینا ضروری ہے کہ انسانی آبادی کا ظہور سب سے پہلے قطبین ہی کی سرزمین میں ہوا ہے۔ لیکن اس کا تعلق ۴۰ کے عدد سے کیا ہے؟ اب اس کو بھی سُن لیجئے۔

اس سے غالباً ہر شخص واقف ہوگا کہ طلوع و غروب کی جو صورت گرم ممالک میں پائی جاتی ہے وہ منطقۂ باردہ سے بالکل مختلف ہے۔ ۸۶½ خط عرض البلا پر (جو قطبین کے نیچے سے گزرتا ہے) شب و روز کے ظہور کی یہ کیفیت ہے کہ وہاں ۲۴ دن تک (یہاں دن سے مراد ۲۴ گھنٹے کا زمانہ ہے) تو بالکل تاریکی رہتی ہے، اس کے بعد تقریباً ۲۴ دن تک صبح صادق کی سی کیفیت رہتی ہے اور پچیسویں دن آفتاب کا ایک گوشہ نظر آتا ہے اور چند منٹ کے بعد غائب ہو جاتا ہے (یہی پچیسواں دن ان کے نوروز کا سمجھنا چاہئے) اس کے بعد پندرہ دن تک آفتاب تدریجاً زیادہ بلند ہو ہو کر غائب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ سولھویں دن بورے ۲۴ گھنٹے تک روشنی دیتا ہے، اس کے بعد روشنی کا وقفہ کم ہوتے ہوتے سولھویں دن پھر تاریکی ہو جاتی ہے۔ لیکن جب آفتاب ایکبار پوری طرح نکل آتا ہے تو پھر وہ تقریباً ۶ مہینے تک غروب نہیں ہوتا اور سروں پر چکر لگایا کرتا ہے۔ اس ۶ ماہ کے طویل دن کے بعد سولہ دن تک وہ زمانہ رہتا ہے جب آفتاب کبھی غروب ہو جاتا ہے اور کبھی نکل آتا ہے، اس کے بعد ۲۴ دن بالکل اسی طرح گزرتے ہیں جیسے شفق پھولی ہو اور پھر ۲۴ دن باری باری طلوع آفتاب اور طلوع شفق کے گزرتے ہیں یہاں تک کہ آفتاب بالکل غائب ہو جاتا ہے اور ۶۵ دن کی طویل رات شروع ہو جاتی ہے ۔۔ ظاہر ہے کہ جس حصۂ زمین میں اتنی طویل رات ہوتی ہو وہاں طلوع آفتاب کا کس بے صبری سے انتظار کیا جاتا ہوگا اور کیا کیا خوشیاں رات کے ختم ہونے پر نہ منائی جاتی ہوں گی۔ جنھوں نے قدیم اقوام کی تہذیب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان سب میں آفتاب پرستی پائی جاتی تھی اور اڈونس، اتیس، تموز، مردوک اور اندر سب سورج ہی کے دیوتا کے مختلف نام تھے۔ قدیم یونان و روما میں اتیس کا احیاء ثانی ۲۵ دسمبر کو منایا جاتا تھا اور یہی تاریخ بعد کو عیسائیوں نے مسیح کے احیاء ثانی کے لئے اختیار کی۔ اس ۲۵ کا راز یہی ہے کہ قطبین میں آفتاب (جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے) ۲۴ دن تک ظہور و خفا کے بعد پچیسویں دن پوری طرح طلوع کرتا ہے۔ چنانچہ قطبین کی قدیم آبادی اسی کو نوروز سمجھتی تھی اور خوشیاں مناتی تھی۔

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ آفتاب کے اولین طلوع کے بعد جو سولہ دن کے ارتباب و ذہاب کے بعد ہوتا تھا پورے ۲۴ دن کے بعد وہ حقیقی دن شروع ہوتا تھا جو ۶۵ دن تک قایم رہتا تھا اور اس لئے گویا پورے ۴۰ دن کے انتظار کے بعد ان کا یوم مسرت شروع ہوتا تھا اور اس طرح چالیس کی اہمیت سب سے پہلے قطبین کی آبادی میں قایم ہوئی ۔ پھر اگر ہم مان لیں کہ انسانی آبادی سب سے پہلے قطبین ہی میں ظاہر ہوئی اور بعد کو وہیں سے چاروں طرف منتشر ہوئی تو آسانی سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ تمام مذاہب و اقوام میں ۴۰ کو کیوں اتنی اہمیت حاصل ہے۔

دُنیا کی نہایت ابتدائی کتابیں

ادب فی الحقیقت بنی نوعِ انسان کے لکھنا پڑھنا سیکھنے سے بہت قبل وجود میں آگیا تھا۔ فنون لطیفہ میں رقص، سب سے پُرانا ارٹ ہے۔ عہدِ عتیق کا وحشی انسان اپنے دشمن پر غالب آنے کے بعد جب الاؤ کے گرد پہلی مرتبہ خوشی سے ناچا کودا اور اُس نے اُچھل کود کر شور مچایا تو گویا سب سے پہلا جنگی ترانہ دنیا میں نمودار ہوا۔ اس کے بعد جیوں جیوں خدا پرستی کا خیال انسانوں میں جڑ پکڑتا گیا، عبادت گزاری کے لئے دعا کا طریقہ بنتا گیا۔ اس کے بعد محض رفاہ عام کے لئے انسان کو لکھنے کا قاعدہ مقرر کرنا پڑا مگر یہ اُسوقت ہوا جب دنیا کسی قدر متمدن ہو چکی تھی اور طرزِ معاشرت و معیشت ایک اُصول کے ماتحت آتی جا رہی تھی

قدیم ترین تحریریں چٹانوں پر بھدے اور بھونڈے نقوش کی صورت میں تھیں اس کے بعد انسان نے آگ میں پکائی ہوئی خشک مٹی کی ٹکیوں پر لکھنا شروع کیا۔ "کلدانیہ" میں ان گلی کتابوں کے نمونے حفریات کے سلسلہ میں سر ہنری ریڈ سنہ دریافت کئے ہیں۔ ان میں سے ایک "برٹش میوزیم" میں موجود ہے اور "طوفان نوح" کے باب میں ہے۔ یہ غالباً دنیا کی قدیم ترین تحریر ہے جو قریباً چار ہزار سال قبل مسیح لکھی گئی تھی۔ عبرانیوں نے اسی کلدانی روایت کی بنا پر "طوفانِ نوح" کا قصہ توریت کی "کتاب الخروج" میں درج کیا تھا جہاں سے وہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے یہاں رواج پا گیا

کلدانی تحریر "میخی" شکل کی ہوتی تھی اور دائیں طرف سے بائیں جانب کو لکھی جاتی تھی۔ جنگی کارناموں کے بیانات اور دعاؤں کے علاوہ کلدانی ٹکیوں پر زراعت و فلاحت، نجوم و سیاست پر بھی تحریریں دستیاب ہوئی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ مٹی کی ٹکیاں جو لیئرڈ اور دیگر ماہرین "اشوریات" نے دریافت کی ہیں مشہور قدیم شہر نینوا میں "سناغرب" کے کتبخانہ کا ایک حصہ تھیں۔ اس کا انتقال ۶۸۱ سال قبل مسیح میں ہوا تھا۔

قدامت کے لحاظ سے مصری ادب کا درجہ کلدانی ادب کے بعد ہی ہے۔ مصری کتابیں "پیپرس"[1] پر لکھی گئیں تھیں۔ سب سے قدیم مصری کتاب "ملوتی"، سب سے بڑے ہرم مصری کی تعمیر کے وقت معرضِ تحریر میں آئی تھی۔ اس کتاب کی

---

[1] نرکل کی قسم کا درخت ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کی پتیوں پر یا اس کے بتیوں سے بنائے ہوئے کاغذ پر لکھنے کا دستور تھا۔ (اڈیٹر)

ایک کاپی برطانوی عجائب خانہ میں محفوظ ہے اور دیوتاؤں، دیویوں، وظایف و اوراد، دعاؤں اور حیات بعد الموت کے حالات پر مشتمل ہے۔ مصری لوگ اس کی ایک نقل ہمیشہ اپنے مُردے کے ساتھ اُس کی قبر میں رکھدیتے تھے تاکہ اس کی دوسری زندگی میں اُس کے لئے ایک دستور العمل کا کام دے اور اُس کی روح کو سیدھے راستہ پر چلائے۔ قدیم مصری ادب بیشتر مذہبی تھا لیکن اس کے علاوہ ایک وہ ادب تھا جسے سرکاری یا دفتری کہنا چاہئے اور تیسرا وہ ہر دلعزیز ادب تھا جسکی بنا عوام کی بولی ٹھولی اور قصے کہانیوں پر قایم تھی۔ چند صدیوں کے اندر مصریوں نے مذہب، اخلاق، قانون، علم کلام، ریاضی، پیمایش، طب، سیاحت اور فسانہ نگاری پر عظیم الشان ادب مجتمع کر دیا تھا لیکن افسوس کہ اس میں سے بہت کم محفوظ رہ سکا۔ دوسری مصری کتاب (The Precepts of Ptah Hotep) دنیا کی دوسری قدیم ترین کتاب ہے۔ ٹاہ ہوٹیپ ممفس میں پیدا ہوا تھا اور ۲۵۰۰ سال ق۔م کے لگ بھگ پایا جاتا تھا۔ یہ کتاب حضرت موسیٰ کی پیدائش اور ہندوستانی مقدس صحایف 'ویدوں' کی تالیف سے دو ہزار سال قبل لکھی گئی تھی اور ہومر اور حضرت سلیمان کی کہاوتوں سے ڈھائی ہزار سال قدیم تر کہی جاتی ہے۔ حضرت سلیمان اور ہمارے درمیان زمانہ اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا کہ ٹاہ ہوٹیپ اور حضرت سلیمان کے درمیان تھا۔ یہ کتاب جو 'پیپرس' پر لکھی گئی تھی آجکل پیرس کے قومی عجائب خانے میں محفوظ ہے یورپی ادب کی پیدائش سے سیکڑوں سال پہلے چین میں کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ لیکن وہ شخص جس نے درحقیقت چینی ادب و اخلاقیات کی بنیاد ڈالی مشہور چینی فیلسوف و مصلح کنفوشیس تھا جو حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پانچ سو برس پہلے چین میں پایا جاتا تھا۔ قدیم ترین چینی کتابیں بانس کے ریشہ سے بنائی ہوئی تختیوں پر لکھی گئی تھیں۔ الفاظ و حروف یا تو اُن پر پکی روشنائی سے لکھے جاتے تھے یا نوکیلے تیز آہنی قلم سے کندہ کئے جاتے تھے۔ چینی کتابیں ریشم پر لکھی ہوئی بھی پائی گئی ہیں۔ کاغذ کے موجد چینی لوگ ہیں اور چین میں کاغذ ۱۰۰ سال قبل مسیح بننا شروع ہو گیا تھا۔ حضرت مسیح کی پیدائش کے وقت تک چینی لوگ چھپائی کے کام کے ماہر ہو چکے تھے اور اُنھوں نے متعدد اقسام کے ٹائپ بغرض طباعت ایجاد کئے تھے۔ یوروپ میں طباعت کتب کا کام شروع ہونے کے تین سو سال قبل چین میں طباعت کتب ارتقائی مدارج طے کر چکی تھی۔ ابتدائی چینی ادب اخلاقیات پر مبنی تھا۔ دوسری صدی ق۔م کے آغاز میں چینی شہنشاہ چی ہوانگ ٹی نے حکماً تمام کتابیں سوائے اُن کے جو علم طب و فن جراحی اور کاشتکاری سے متعلق تھیں جلوا ڈالی تھیں۔ یہ چین کا نہایت افسوسناک اور زبردست قومی و ادبی نقصان تھا۔ تاریخ ادب میں قدیم ترین نسوانی مصنف ایک چینی عورت پاؤ چاؤ نامی تھی جو عیسائیت کے آغاز میں ایک مسلمہ تاریخ داں مانی جاتی تھی۔ چین کا قدیم ادب بہت ضخیم، وسیع اور شاندار ہے لیکن 'کلاسکل' مصنفین کے بے پناہ اثر کے باعث چین کی قوم دنیا کی سب سے زیادہ لادقیانوسی اور ضعیف الاعتقاد قوم ہو کے رہ گئی ہے اور اسی وجہ سے چینی زبان تاریخ کے آغاز سے لیکر آج تک جوں کی توں بلا کسی ترمیم و تنسیخ کے قایم ہے۔

ہندوستان کی قدیم ترین و مقدس ترین کتاب 'وید' حضرت عیسیٰ سے غالباً ایک ہزار سال قبل لکھی گئی تھی۔ گوتم بدھ چھٹی صدی ق۔م میں زندہ تھا۔ اُس کی تعلیمات نے بہت بڑے پیمانہ پر یہاں مذہبی ادب کی بنیاد ڈالی اور کتابیں یا تو صاف کئے ہوئے چمڑے پر اور یا جھاؤ اور تاڑ کے پتوں پر لکھی گئیں۔ قدیم ترین عبرانی کتب بھی تقریباً ۶۰۰ سال (ق۔م) لکھی گئی تھیں۔ جہاں تک انسانی معلومات کا دخل ہے جاپان اب سے ایک ہزار سال پیشتر کوئی ادب موجود نہ تھا۔ کیونکہ وہاں بھی، چین و یونان کی طرح صدیوں تک مقررین کا دور دورہ رہا اور کتابیں بہت بعد میں لکھی گئیں۔

فینشی قوم جو سامی نسل سے متعلق تھے اور شمالی افریقہ میں رہتے تھے اُس زمانہ کی سب سے بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ اُن کا دارالحکومت قرطاجنہ دنیا کا قدیم ترین تجارتی مرکز کہا جاتا ہے۔ اہلِ یونان نے فنِ تحریر انھیں فینشیوں سے سیکھا۔ اہل یونان نے حرف تہجی آٹھویں صدی (ق۔م) میں ایجاد کئے اور پانچویں صدی (ق۔م) سے درس و تدریس کا کام باقاعدہ شروع ہوگیا

اسکندریہ نے یونانی کلچر اور علوم و فنون کے مرکز ہونے کی حیثیت سے ایتھنز کا درجہ گرا دیا۔ قدیم مصری حکمرانوں جو بطلیموس[1] کے خطاب سے مخاطب کئے جاتے تھے علوم و فنون کے بڑے شیدا اور سرپرست تھے۔ اسکندریہ کی صرف ایک لائبریری میں اُسوقت سات لاکھ یونانی کتب محفوظ تھیں۔ اس لائبریری کا کچھ حصہ رومی فاتح جولیس سیزر نے ۴۸ سال قبل مسیح میں جلا ڈالا تھا۔ بعد ازاں عیسائی مشنریوں نے اسکندریہ کی متعدد لائبریریاں برباد کیں اور اس کا الزام حضرت عمر فاروق کے سر تھوپا گیا

تیسری صدی (ق۔م) میں اسکندریہ یونانی ادب کا عظیم الشان مرکز تھا اُسی زمانہ میں رومی مصنفین نے ایتھنز والوں کی تقلید میں اپنا ذخیرۂ ادب مرتب کرنا شروع کیا۔ اسکندریہ کی یہ ممتاز ادبی حیثیت، رومیوں کے ہاتھ سے فتح ہونے کے بعد بھی پانچویں صدی عیسوی تک قایم رہی اور اسکندریہ تہذیب و تمدن، علوم و فنون کا گہوارہ بنا رہا۔

ابتدا میں رومی ادب یونانیوں کی ملکیت تھا۔ جب روم، عسکری و سیاسی حیثیت سے اُس عہد کی متمدن دنیا کا مرکز سمجھا جانے لگا تو اطراف عالم سے علماء و فضلاء وہاں آ آکر آباد ہونے لگے، ٹھیک اُسی طرح جس طرح کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں مقررین و مصنفینِ عالم کا اجتماع پیرس (فرانس) میں ہوا تھا۔ بایں ہمہ ایک طویل مدت تک روم کی ادبی زبان یونانی ہی رہی اور جب لاطینی ادب کا نشو و نما ہوا تو وہ سراسر یونانی ادب کا چربہ تھا۔ ہومر کا ترجمہ لاطینی میں کیا گیا پہلی صدی قبل مسیح سے پیشتر یعنی "لاطینی ادب کے عہد زریں" کے آغاز سے قبل اکثر لاطینی مصنفین غیر لاطینی الاصل اور نو وارد تھے لاطینی ادب کا 'کلاسکل عہد' ایک صدی سے زیادہ قایم نہیں رہا۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے ایک سو سال پہلے سے اُن کی پیدائش کے وقت تک (ایک صدی کے اندر) سسیرو، لکریشس، سیزر، ہوریس، ورجل، اووڈ اور لوی پیدا ہوئے، اور اپنے ادبی کارناموں کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے

---

[1] اسکندر کے زمانہ سے لیکر کلوپطرہ کے عہد تک مصر کے فرمانروا بطلیموس کہلاتے تھے۔ (اڈیٹر)

علم الاصنام، اور بعید از عقل کہانیوں ہی سے ہر قوم کا ابتدائی ادب لبریز رہا ہے۔ کیوپڈ اور سائکی کی کہانی یونانی اساطیر کی نہایت مشہور و دلفریب کہانی ہے۔ اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ — سائکی ایک بادشاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ حسن کی دیوی وینس نے جلکر اپنے بیٹے کیوپڈ کو اس کے قتل پر مامور کیا۔ کیوپڈ رات کی خموشی و تنہائی میں سائکی کے کمرہ میں داخل ہوا مگر حسن و جمال کے اس زندہ پیکر کو دیکھ کر حیران رہگیا اور جو تیر وہ سائکی پر چلانے والا تھا وہ خود اسی کے سینہ میں پیوست ہوگیا، آخرکار کیوپڈ، سائکی سے ملنے لگا مگر اس نے یہ کہدیا تھا کہ سائکی اس کا نام معلوم کرنے کی کوشش کبھی نہ کرے گی اور نہ کبھی، دشتی میں اس کا چہرہ دیکھنے کا خیال کرے گی۔ عرصہ تک سائکی اس پر عمل کرتی رہی مگر آخرکار اس سے ضبط نہ ہوا اور ایک رات اپنا لمپ روشن کرکے اس نے کیوپڈ کے چہرہ کو دیکھا اور اسی گھبراہٹ میں لمپ کا ایک قطرہ ٹپک کر کیوپڈ کے شانہ پر ٹپک پڑا۔ کیوپڈ کی آنکھ کھل گئی اور وہ غائب ہوگیا! اسکے بعد سائکی نے بڑی مصیبتیں برداشت کیں اور آخر میں کیوپڈ پھر مل گیا۔

اسی قصہ کی نقل ناروے کی وہ قومی کہانی ہے جس میں ایک دولہن فریجا نامی اپنے خاوند اوڈر نامی کی حکم عدولی کرتی ہے۔ ہندوستانی وید میں بھی پرورداا اور اُرواسی کا قصہ اسی سے ماخذ ہے اور ویلز اور جنوبی افریقہ کی زولو قوم میں ایسی ہی ایک حکایت پائی جاتی ہے

کیوپڈ اور سائکی سے زیادہ مشہور کہانی ڈاینا اور انڈیمین کی ہے جس کی نقل مختلف زبانوں میں ملتی ہے۔ ڈاینا، چاند کی دیوی، ایک مرتبہ آسمانوں پر اپنے دودھ جیسے سفید گھوڑوں والی گاڑی پر بیٹھی چلی جاتی تھی کہ اس نے ناگاہ ایک پہاڑی پر انڈیمین نامی ایک حسین و جمیل نوجوان گڈریے کو سوتا ہوا پایا۔ اس فانی انسانی حسن نے اس کو مایل بہ زمین کیا وہ اتری اور جھک کر اس نے جوان گڈریا کا منہ چوم لیا۔ ہر شب کو وہ اسی طرح آسمانوں پر سے اس پہاڑی پر ایک لمحہ کے لئے اترتی اور انڈیمین کا منہ چوم کر چلی جاتی۔ بائرن نے اپنی ایک نظم میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اپنے محبوب انڈیمین کے حسن و شباب کو زندہ جاوید کرکے ڈاینا نے اسے انسانی دسترس سے دور ایک کوہستانی غار میں ابدی نیند سلا کر لٹا دیا ہے۔ جہاں وہ اس کا ایک بوسہ لینے کے لئے ہمیشہ شب کو جایا کرتی ہے — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فسانہ سے آسٹریلیا کے قدیم باشندے بھی واقف ہیں کیونکہ ان کے یہاں بھی ایک ایسا ہی قصہ بیان کیا جاتا ہے سنگھالی (لنکا کے باشندے) اور بعض افریقی اقوام بھی ایسی ہی روایت بیان کرتی ہیں — یہ عسیر العقل کہانیاں ادب کی پیدائش سے بہت پیشتر انسان کا واحد ذہنی سرمایہ تھیں اور انھوں نے ہر زمانے اور ہر عہد میں شعراء کو متاثر کیا اور ان کے لئے ذخیرۂ فکر مہیا کیا ہے۔ نہ صرف ہومر اور اوڈ وغیرہ ان کہانیوں کے ناقل ہیں بلکہ جدید شعراء مثلاً براؤننگ، ہاتھورن، ہیرک، لانگ فیلو میرپڈتھ، ولیم مورس، پوپ، سوئن برن، ٹینی سن خصوصاً بائرن، شیلے، کیٹس اور روزیٹی بھی اپنی نظموں میں ان کو بار بار دہراتے ہیں۔ علم الاصنام و اساطیر ہی کی وجہ سے بڑے بڑے نقاش و مصور و مجسمہ ساز، مغربی یورپ میں

حیرت انگیز و نادر نمونے اپنے کمالِ فن کے پیش کر سکے اور صدیوں بعد انھیں کہانیوں نے رفائیل سے پہلے کے نقاشوں کی قوتِ فکر و پروازِ تخیل کو متاثر کیا تھا۔ یہ اہم بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لٹریچر کی ابتدا باہمی تعاون سے ہوئی نہ کہ انفرادی مساعی سے۔ ستاروں اور سیاروں کی ابتدائی دلچسپ کہانیاں، نیز ابتدائی نغمے جو ماؤں نے اپنے بچوں کو گا گا کر سُنائے بہ عہد اُلٹتے پلٹتے، بدلتے بدلاتے اُس زمانہ تک جا پہونچے کہ انسان نے لکھنا پڑھنا ایجاد کر لیا اور یہ کہانیاں اور نغمے درختوں کی چھالوں پر کندہ کئے گئے یا پیپرس پر لکھے گئے۔ جب انسان نے پہلی مرتبہ لکھنا شروع کیا تو سوانح اور تاریخی روایات پر ایک ضخیم مواد لوگوں کے سینوں میں موجود تھا جو بلا دقت معرضِ تحریر میں آتا رہا

انسانی زندگی میں، شادی اور موت کے متعلق بھی خاص خاص رسمیں وجود میں آتی گئیں۔ متداخل فصلیں پر بھی مخصوص رسوم معین ہوئیں، دیوتاؤں اور دیویوں پر چڑھاوے چڑھائے گئے۔ موسم بہار، فصل کاٹنے کے ایام، کھیتوں میں بیج ڈالنے کا موسم وغیرہ وغیرہ آغازِ تمدن میں انسان کے لئے مخصوص اوقات تھے۔ ان عادات و رسوم نے ابتدائی تحریر انسانی کو بہت متاثر کیا۔ مزید براں بچوں کو سُلانے اور زچہ خانہ کی کہانیاں، دیوتاؤں وغیرہ کے ڈرامے، قصے، کہاوتیں اور ضرب الامثال وغیرہ بڑی تعداد میں سینہ سے زبان پر اور زبان سے نوکِ قلم پر آکر ابتدائی ادب انسانی کا باعث ہوئے

"نظم تحریر سے بہت زیادہ پرانی ہے۔ اینڈریو لینگ کہتا ہے کہ :-

"نظم کی موجودہ صورت بیشک نسبتاً جدید ہے۔ مگر نظمیں اور نغمے سیکڑوں برس تک انسان بغیر لکھے پڑھے مزے لے لیکر گاتا رہا زبانیں پھیلیں، بگڑیں اور سُدھریں لیکن ان لسانی تغیرات نے اُن منظوم تخیلات اور رومانی ترانوں پر کچھ اثر نہ کیا جو تمام دنیا پر چھا گئے تھے اور جن کی پیدائش کی کوئی تاریخ معین نہیں کی جا سکتی"

خوشی کے اوقات میں ناچ ناچکر انسان اپنے منہ سے جو کلمات سُر کے ساتھ نکالتا تھا وہی موجودہ نظم و موسیقی کی ابتدا تھی اور تمدن و تہذیب حاصل کرتے ہی یہی چیزیں مناسب ترمیم و تنسیخ، تغیر و تبدل کے بعد انسان نے لکھنا شروع کیں۔ والٹس ڈنٹن نظم کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ :- "نظم ذہن انسانی کی وہ تراوشِ فکر ہے جو جذبات کی شورش کے عالم میں نپی تلی زبان میں ادا ہو"

یونان اور روم کے "عہدِ زریں" میں بہت کم آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے لیکن گاتے سب تھے۔ اُن "تاریک صدیوں" میں جو سلطنتِ رومۃ الکبریٰ کے زوال کے بعد کتابوں کے پڑھنے والے تھوڑے رہ گئے تھے مگر نغمے پھر بھی گائے جاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بے پڑھے لکھے لوگ ہر زمانہ اپنا ایک لٹریچر رکھتے تھے جو اُنھیں کے سینوں میں دفن رہتا تھا اور یہ امر کسقدر حیرتناک ہے کہ مشرق و مغرب، شمال و جنوب ہر جگہ اور ہر مقام پر قوموں نے اپنا لٹریچر نثر و نظم دونوں میں ایک ہی انداز سے حاصل کیا ہے یہی نہیں بلکہ بعض اوقات مشرقِ بعید کی ایک کہانی مغربِ بعید کی کسی کہانی سے ایسی مطابقت رکھتی ہے کہ گویا یہ دونوں ایک ہی وقت میں ایک ہی انسان نے وضع کی تھیں

محمود بریلوی

(ماخوذ)

تاریخ اودھ کا ایک ورق

(مکّا درزی)

اب سے ٹھیک ایک صدی پہلے کی بات ہے۔ حاتم دوراں نصیر الدین حیدر کا عہدِ حکومت ہے (۱۸۲۷ء سے لیکر ۱۸۳۷ء) اور ہر شخص مسرت و اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس عہدِ زریں میں ہر طرف ہُن برس رہا تھا اور لکھنؤ رشکِ فردوس بنا ہوا تھا۔ بادشاہ کی داد و دہش کا شہرہ سنکر لوگ دور دور سے بخت آزمائی کے لئے یہاں آتے تھے اور جس کی رسائی ذات شاہانہ تک ہو جاتی تھی وہ واقعی خاک سے پاک ہو جاتا تھا۔ انھیں خوش نصیبوں میں خیر آباد کا مکا درزی بھی تھا جو یاوری قسمت سے شاہ نصیر الدین حیدر کے دربار میں شاہی درزیوں کا جمعدار ہو گیا۔ توشہ خانہ کا تمام سامان اسی کی معرفت خریدا جاتا تھا اور یہ ایک ایک کے دس دس وصول کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مکا کو انگیا کرتی سینے میں کمال حاصل تھا اور یہی بات اُس کی ترقی کا باعث ہوئی۔ اس کا نام اب مکا سے مکا خاں ہو گیا، مگر باوجود اس دولت و اقتدار کے وہ بہت ہی ملنسار اور متواضع تھا۔ تمکنت و غرور نام کو نہ تھا۔ ہر شخص سے جُھک کر ملتا تھا۔ کنبہ والوں کی پرورش کرتا تھا۔ غیروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا تھا اور سوئی ہمیشہ پگڑی میں لگی رہتی تھی۔ اپنے وطن خیر آباد میں اسنے بہت سی عمارتیں (مسجد، امام باڑہ، خانقاہ، قدم رسول) اور متعدد اونچے اونچے مکان تعمیر کرائے جو اب بھی موجود ہیں۔ مگر وہ ہمیشہ خود کچّے مکان میں رہا تاکہ اگلی حالت اسکو بھول نہ جائے

کرنل سلیمن (Col: Saleeman) رزیڈنٹ اودھ بہ سلسلۂ سیاحت اودھ (۱۸۵۰ء) اپنے سفرنامہ میں تحریر کرتے ہیں کہ:۔ "خیر آباد میں خوشنما عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جس میں مکا کے باپ کا مقبرہ۔ مسجد۔ امام باڑہ۔ قدم رسول اور دوسری عمارتیں شامل ہیں۔ یہ سب مکا درزی ملازم شاہ اودھ نصیر الدین حیدر کی تعمیر کردہ ہیں جو اپنے آقا کی نگاہ لطف و کرم کی بدولت بہت ہی دولتمند ہو گیا تھا۔ مکا ابھی زندہ ہے اور عمارتوں کی برابر مرمت کراتا رہتا ہے ان عمارتوں میں گداگروں کے غول کے غول بھرے رہتے تھے اور اُن کی صداؤں سے اتنا شور و شغب ہوتا تھا کہ کانوں کے

پردے پھٹے جاتے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک ادنیٰ درجہ کے آدمی نے کیسی کیسی عظیم الشان عمارتیں کھڑی کردی ہیں اور اُن کے قیام و بقا کے لئے جائداد بھی وقف کردی ہے"

مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب نے جو مکا کے ہمعصر تھے اُس کی آسودگی اور تونگری کا تذکرہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:- "مکا خیاط مالِ دنیا سے مالامال ہے۔ استغنا کا دم بھرتا ہے۔ سینا تو کیا ٹانکا بھی کم بھرتا ہے۔

روایت ہے کہ شاہ دہلی نے اپنی ایک محبوب بیگم کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی لاگت کا ایک بھاری تولواں جوڑا بنوایا تھا شدہ شدہ یہ خبر قدسیہ محل کے کانوں تک پہونچی جو شاہ نصیر الدین حیدر کی بہت چہیتی اور دریا دل بیوی تھیں انھوں نے بھی بادشاہ سے فرمائش کردی کہ میرے لئے ایک لاکھ روپیہ کا جوڑا طیار کرا دیجئے۔ بادشاہ نے مکا کو جوڑے کی طیاری کا حکم دیدیا۔ مکا حسب ارشاد عالی جوڑے کی طیاری میں مصروف ہوگیا۔ چھ ماہ کی مدت میں دوسرے درزیوں کی مدد اور مشورے سے یہ جوڑا طیار ہوا جس میں لعل اور گوہر ٹنکے ہوئے تھے۔ مکا اس جوڑے کو ایک خوبصورت کشتی میں قرینہ سے سج کر روشن چوکی کے ساتھ درِ دولت پر لے گیا۔ جوڑا بہت پسند کیا گیا اور مکا انعام و اکرام سے سرفراز ہوا۔

ایک روز میاں مکا تفریحاً ہودج میں پشت فیل پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ خاص بردار جلو میں تھے۔ ایک پٹھان صاحب بازار میں کھڑے تھے وہ ایک درزی کی سواری اس طمطراق سے جاتے ہوئے اور اُسے فیل نشین دیکھ کر سے آتش حسد سے جل بھنکر خاک ہوگئے اور دل کے جلے پھپھولے پھوڑنے کو پکار کر کہا ہمارا بند ٹوٹ گیا ہے جو ٹانک دیگا اُس کو اُجرت ملے گی۔ یہ سنتے ہی مکا ہاتھی سے اُتر پڑا۔ پٹھان کے پاس آکر بندسی دیا اور دعائیں دینے لگا۔ پٹھان صاحب شرم سے پانی پانی ہوگئے۔ مکا ہاتھی پر بیٹھکر چلدیا"

راجہ غالب جنگ نے مکا کی بیخکنی کی کوشش کی تھی مگر اُن کی چال اُلٹ گئی اور صیاد خود صید ہوگیا جس نے دوسرے کی بیخ اُدھیڑنا چاہی تھی خود اسی کا گریبان چاک ہوگیا اور مکا لالوں کا لال بنا رہا چونکہ اس واقعہ سے اُس زمانہ کے طرزِ حکومت پر بھی روشنی پڑتی ہے اس لئے میں اُس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہوں

راجہ غالب جنگ قوم کے کورمی عہد نصیر الدین حیدر میں مہتمم پولیس تھے اور پیدل فوج کا ایک دستہ بھی اُن کے زیر کمان تھا۔ علاوہ ان عہدوں پر فایز ہونے کے وہ جہاں پناہ کے نظر کردۂ خاص تھے اور ہر وقت سایہ کی طرح اُنکے ہمراہ رہتے تھے حتےٰ کہ بادشاہ کی عیش و نشاط کی نجی صحبتوں میں بھی اُن کو حاضری کا اعزاز حاصل تھا مگر وہ اپنی سخت گیری اور بدمزاجی کے لئے بہت بدنام تھے اور اپنے رسوخ کے گھمنڈ میں وزیر اعظم روشن الدولہ کا بھی موقع بے موقع مذاق اُڑایا کرتے تھے جس سے سب ان کے مخالف ہوگئے تھے۔

بادشاہ نے رنجیت نامی ایک جوان کو بہت منہ لگا رکھا تھا۔ یہ شخص روشن الدولہ کا نمک پرورد تھا مگر بعد کو بادشاہ کا معتمد خاص ہوگیا تھا اور جو لوگ وزیر اعظم کے درپے تخریب ہوتے تھے اُن کو برطرف کرانے کی اُدھیڑبن میں

میں لگا رہتا تھا۔

مکا خیاط بھی اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے غالب جنگ کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ ان دونوں سے بادشاہ کا دوسرا معتبر ملازم گنگا خواص بھی در پردہ ملا ہوا تھا۔ ان تینوں نے بعض بیگمات کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا تھا جو ان لوگوں کی برابر حمایت کرتی رہتی تھیں۔ بادشاہ بعض اوقات غالب جنگ کی معرفت عورتوں کو بھی بلوایا کرتے تھے۔ ایک روز انھوں نے موگیری نامی ایک عورت کو پیش کرنے کی فرمائش کی۔ جب کافی وقت گزر گیا اور وہ حاضر نہ ہوئی، بہت مضطرب ہوئے دھنیا مہری سے اُس کے حاضر نہ ہونے کا سبب دریافت کیا تو اُس نے بادب کہا۔ خداوند کیا عرض کروں کچھ کہتے بن نہیں پڑتا راجہ بڑے ہی ذات شریف ہیں خود رنگ رلیاں مناتے ہیں اور خدمت عالی میں پیش نہیں کرتے۔ جب دوسرے حاضرین نے بھی جو آپس میں ساز باز کئے ہوئے تھے اس بیان کی تصدیق کی تو بادشاہ آگ بگولا ہو گئے مگر اسوقت غصہ پیکر خاموش ہو رہے اور موقع محل کے منتظر رہے وہ چاہتے تھے کہ کسی دوسری بات کا حیلہ کر کے راجہ سے عوض لیا جائے تاکہ کسی کو یہ نہ معلوم ہو کہ یہ باہمی رقابت کا نتیجہ ہے۔ سلیمن صاحب رزیڈنٹ اودھ ناقل ہیں کہ دھنیا مہری کے بیان میں ذرہ برابر کذب و دروغ نہ تھا کیونکہ بعد کو خود موگیری نے تسلیم کر لیا کہ اُس کو راجہ نے روک لیا تھا

۷ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو بادشاہ اپنے نجی کمرہ میں کسی سیاسی امر پر غالب جنگ سے گفتگو کر رہے تھے اور میز پر جواہرات چنے ہوئے تھے جو مکا کی زیر نگرانی تیار ہوئے تھے اور جن کا کل ساز و سامان بھی اُسی کی معرفت خریدا گیا تھا۔ مکا جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے بادشاہ سے ہر چیز کی دس گنی قیمت لیا کرتا تھا اور اُس کے منھ مانگے دام بے چون و چرا آنکھ بند کر کے ادا کر دئے جاتے تھے۔

غالب جنگ نے دیکھا کہ مکا کی بددیانتی ظاہر کرنے کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا اس لئے انھوں نے ایک تاج اُٹھا کر اُس کو اپنی اُنگلی پر نچانا شروع کر دیا یہاں تک کہ اُنگلی تاج کے بالائے حصے کو پھاڑ کر باہر نکل آئی جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ مال مسالہ بہت ادنے قسم کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ راجہ نے بوجہ سابقہ بے تکلفی کے بادشاہ کو مخاطب کر کے عرض کیا "حضور تاج میں چھید ہو گیا"، چونکہ بادشاہ کو تاج و تخت بہت متنوں مرادوں سے نصیب ہوا تھا اس لئے یہ جملہ اُن کے لئے سوہانِ روح ہو گیا اور بغیر کچھ ارشاد کئے وہ اُٹھ کر کمرہ کے باہر تشریف لے گئے۔ اُس کے بعد فوراً ہی چند ملازمین نے اندر آ کر راجہ کو چاروں طرف سے گھیر کر کہا کہ تا صدور حکم ثانی اپنی جگہ سے جنبش نہ کیجئے گا تقریباً دو گھنٹہ تک راجہ اسی مخمصہ اور گومگو کی حالت میں بیٹھے رہے اُس کے بعد چند اور خدام بھی کمرے میں آ گئے جنھوں نے راجہ کی پگڑی اُتار کر بغرض اہانت زمین پر پھینک دی اور اُس کو جلال خوروں سے ٹھوکریں دلوا کر کمرہ کے باہر پھکوا دیا۔ اسکے بعد راجہ کو زنداں میں بھیجکر دوسرے روز پابزنجیر کر دیا گیا اور اُنکے مکانات پر پہرہ بٹھا دیا تاکہ کوئی شخص راجہ کے خاندان کا نقل و حرکت نکرے اور راجہ کی جایداد بھی ضبط سرکار ہو گئی۔

تیسرے روز راجہ کے تازیانے بھی بہت سختی سے لگائے گئے تاکہ چھپی ہوئی دولت بھی بتا دیں اُسی روز شام کو بادشاہ نے نشہ کی ترنگ میں فرمان جاری کر دیا کہ راجہ کا دایاں ہاتھ قلم کر دیا جائے اور ناک بھی اُڑا دیجائے مگر وزیر اعظم نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اگر ارشاد عالی پر عمل کیا گیا تو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے سخت اندیشہ ہے بادشاہ یہ سُنکر استراحت فرمانے چلے گئے مگر دوسرے روز راجہ کو پھر کوڑے لگانے کا حکم نافذ کر دیا۔

چھ یا سات دن کے بعد راجہ کے کل ملازمین اُن کے پاس سے ہٹا دئے گئے اور حکم ہوا کہ راجہ کے پاس کوئی نہ جانے پائے — ۱۹ اکتوبر سنہ مذکور کو اعلےٰ حضرت نے ایک اور فرمان جاری کیا کہ خاندان غالب جنگ کی کل مستورات در دولت تک پیدل لائی جائیں اور سب کے سر مونڈ کر اور ننگا کر کے شارع عام پر نکال دیجائیں۔ یہ حکم دیکر بادشاہ آرام خاص کو تشریف لے گئے۔ کل عورتیں حسب الحکم محلسرا میں لائی گئیں مگر ملازمین شاہی بوجہ اُن کی معصومیت اور بیگناہی کے اُن کے ہمدرد و غمگسار ہو گئے تھے اس لئے بجائے بے پردہ پیدل لانے کے اُن کو پردہ دار ڈولیوں میں سوار کر کے عزت و حرمت سے لائے۔

رزیڈنٹ نے اس اندیشہ سے کہ مبادا اِن مستورات کی اور زیادہ توہین و تحقیر کی جائے اور غالب جنگ کو فاقے دے دیکر ہلاک کر دیا جائے۔ مداخلت کا تہیہ کر لیا اور بادشاہ کی خدمت میں عین اسوقت بغرض ملاقات حاضر ہونا چاہا جبکہ وہ بستر استراحت پر تھے۔ بادشاہ کو یہ نہایت شاق گزرا اور وزیر کو بھیجکر رزیڈنٹ سے کہلا بھیجا کہ اگر آپ صرف غالب جنگ کے اہل خاندان کی رہائی کے لئے تکلیف کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں حکم دے رہا ہوں کہ کل مستورات اپنے اپنے مکانوں کو واپس کر دیجائیں مگر رزیڈنٹ پھر بھی ملاقات پر مصر ہوئے۔ بادشاہ بالکل خاموش بُت بنے بیٹھے رہے اُن کی جانب سے وزیر اعظم جوابدہی کرتے رہے۔ انھوں نے اس امر سے تو بالکل انکار کر دیا کہ ملزم کو دو روز سے کھانا پانی بالکل نہیں دیا گیا ہے مگر اس کا اقبال کیا کہ اُن کو سزائے تازیانہ دیگئی ہے اور مستورات ابتک مجلس میں موجود ہیں مگر اُن کو فوراً آزاد کر کے روانہ کر دیا جائے گا۔ وزیر نے یہ بھی بیان کیا کہ راجہ کی جایداد ضبط کرنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ اُن کے ذمہ بڑی بڑی سرکاری رقمیں واجب الادا ہیں۔ اس کے بعد مستورات اپنے اپنے مقاموں کو واپس کر دیگئیں اور غالب جنگ کو اجازت ہو گئی کہ اپنی خدمت کے لئے چار ملازم رکھ لیں

اس کے بعد راجہ درشن سنگھ نے جو بہت ہی با اثر آدمی تھے اور غالب جنگ کے سخت دشمن تھے بادشاہ کی خدمت میں عرضی پیش کی کہ غالب جنگ کو فدوی کے سپرد کر دیا جائے، اس تجویز کو بادشاہ اور وزیر دونوں نے بخوشی منظور کر لیا اور وزیر اعظم نے درشن سنگھ سے تین لاکھ روپیہ لیکر غالب جنگ کو اُن کے حوالہ کر دیا اور رزیڈنٹ کو یہ کہکر اطمینان دلا دیا کہ درشن سنگھ غالب جنگ کے دوست ہیں وہ اُن کو اور اُن کے متعلقین کو بہت آرام اور آسایش سے رکھیں گے درشن سنگھ نے غالب جنگ کو ایک آہنی پنجرہ میں بند کرا کے اپنی گڑھی واقع شاہ گنج میں بھیجدیا۔

بعد انتقال نصیر الدین حیدر، غالب جنگ نے چار لاکھ روپیہ ادا کر کے قید و بند سے گلو خلاصی حاصل کی اور وعدہ کیا کہ اگر اپنے منصب پر بحال کر دیا جاؤں گا تو تین لاکھ روپے اور حاضر کروں گا قید سے رہائی پانے پر وہ بمقام کانپور پنشنی کی عملداری میں قیام پذیر ہوئے اور تین ماہ کے بعد جب روشن الدولہ برطرف ہوئے اور خلعت وزارت نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کو عطا ہوا تو اپنی جگہ پر پھر مقرر کر دئے گئے اور بمقام لکھنؤ بتاریخ یکم مئی ۱۸۵۱ء بعمر تخمیناً اسی سال وفات پائی۔

مکا کے بالائی حصۂ جسم کی ایک قلمی تصویر عجائب خانہ لکھنؤ میں موجود ہے۔ سر پر لٹو دار پگڑی اور گلے میں بادامی رنگ کا انگرکھا ہے۔ شانہ پر سہ گوشیہ رومال ہے جس کے دو کونے سینے پر لا کر گرہ دیدی گئی ہے۔ کمر حسب رواج زمانہ کسی ہوئی ہے۔ مسیں بھیگتی ہیں اور سبزہ آغاز ہے چہرہ کتابی اور سڈول ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی پیشانی کشادہ اور رنگ گندمی ہے۔ بشرے سے نیکدلی ٹپکتی ہے اور فہم و فراست کے آثار بھی پائے جاتے ہیں

خدا نے مکا کو سب نعمتیں عطا کی تھیں مگر اولاد نرینہ سے محروم رہا۔ اُس نے خیر آباد اپنے وطن میں سفر آخرت اختیار کیا اور وہیں اُس کی دائمی خواب گاہ ہے اُس کی رحلت کے بعد اُس کی بیوہ اور نواسہ علی بخش جایداد کا مالک ہوا لکھنؤ میں باغ مکا اور مکا گنج ابتک اس کی یادگار موجود ہیں۔

شیخ تصدق حسین بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی

"نگار" کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کریں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(۱۹۲۶ء) جنوری ۵ر- (۱۹۲۷ء) اپریل ۴ر- (۱۹۳۰ء) مئی ۴ر- (۱۹۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ - (۱۹۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل) ۴ر فی پرچہ - (۱۹۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ - (۱۹۳۴ء) فروری ۴ر - (۱۹۳۵ء) فروری، اپریل تا اگست، اکتوبر تا دسمبر ۵ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵ر فی پرچہ - (۱۹۳۷ء) مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، نومبر ۸ر فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

مثنوی سحر البیان

گرمی کے کنارے عشق و عاشقی کے سیکڑوں کھیل کھیلے گئے ہزاروں کہانیاں بنیں۔ لاکھوں شعر کہے گئے لیکن حسن و محبت وصل و جدائی کا افسانہ جیسی میٹھی زبان اور فصیح بول چال میں میر حسن دہلوی نے سنایا کسی دوسرے شاعر یا ادیب کو نصیب نہ ہوا۔ قبولیت عام جسقدر اس مثنوی کے حصہ میں آئی اُردو کی کسی عاشقانہ نظم کو سوائے گلزار نسیم کے نصیب نہ ہوئی۔ جو اسکی شاعرانہ خوبیوں کا لطف اُٹھا سکتے تھے انھوں نے پڑھا اور مزہ لیا۔ جو شعر و سخن کا مذاق نہ رکھتے تھے انھوں نے کہانی کی قدر کی۔ پڑھ نہ سکتے تھے تو دوسروں سے پڑھوا کر سنا اور جو دو چار شعر یاد ہو گئے ان کو الاپنا شروع کیا۔

حسن تخلص۔ میر غلام حسن نام۔ دلی کے رہنے والے تھے۔ بارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ فیض آباد آئے۔ نواب سردار جنگ خلف نواب سالار جنگ بہادر کی سرکار سے پرورش ہوئی۔ کئی برس وہاں رہکر نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پہونچے اور مثنوی سحر البیان یہیں تمام کی۔ شعر و سخن سے موروثی ذوق تھا۔ مذاق ستھرا طبیعت مناسب پائی تھی۔ سونے پر سہاگہ کہ وقت بھی اچھا ملا۔ بیگمات کی محفلوں میں رسائی ہوئی۔ امیرانہ تکلفات اور شاہانہ رسوم دیکھنے برتنے کا موقع ملا۔ ناچ رنگ گانے بجانے کے جلسے دیکھے۔ باغوں کی بہار۔ مکانوں کی آرائش۔ شاہی سواریوں کے تماشے نظر سے گزرے۔ خیالات کی بلندی اور طبیعت کی موزونی سے جو کچھ کانوں سنا یا آنکھوں دیکھا اُس کی تصویر نظم میں کھینچکر رکھدی۔

مثنوی سحر البیان ۱۱۹۹ھ میں تمام ہوئی اور اُس کی تصنیف کو آج ڈیڑھ سو برس سے زیادہ عرصہ گزرا لیکن اسکی زبان قریب قریب وہی ہے جو اسوقت بولی جاتی ہے۔ آصف الدولہ کے عہد کا فیشن اور اس دور کے رسوم و رواج آج بہ زبانِ حال سحر البیان میں موجود ہیں۔

قصہ کی رنگینی۔ جواب و سوال کی نوک جھونک۔ اندازِ بیان کی دلچسپی۔ مضمون کی شوخی۔ قافیوں کی چستی، بندش کی صفائی نے مثنوی میں چار چاند لگا دئے۔ اور سچ یہ ہے کہ اس شان کی مثنوی نہ میر حسن کے وقت سے پہلے

موجود تھی اور نہ اُس کے بعد لکھی جا سکی۔ خود فرماتے ہیں:۔

نئی طرز ہے اور نئی ہے زبان نہیں مثنوی ہے یہ سحر البیان
جو منصف سنیں گے کہیں گے یہی نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہو گی کبھی

اس مثنوی کی سب خوبیاں ایک مختصر مضمون میں بیان نہیں ہو سکتیں۔ آج صرف قصہ بیان کیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ چند شعر بھی سنائے جائیں گے۔

اگلے وقتوں میں ایک بڑے شان و شوکت کا بادشاہ تھا۔ کئی ملکوں کے راجہ اُس کی پرجا تھے۔ فوج لشکر۔ لونڈی غلام۔ زر و جواہر کی کمی نہ تھی۔ خدا کا دیا سب کچھ موجود تھا مگر اولاد نہ تھی اور ایک چراغ کے نہ ہونے سے گھر میں اندھیرا تھا۔ جب بڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے اور کلیجے کی ٹھنڈک نصیب نہ ہوئی تو اُس نے راج پاٹ چھوڑ کر فقیری لینے اور بقیہ زندگی یادِ خدا میں بسر کرنے کا ارادہ کیا۔ وزیروں امیروں نے سمجھایا کہ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا اور معبود کی یاد کے لئے دُنیا کا کاروبار چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔

فقیری بھی کیجئے تو دنیا کے ساتھ نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ

بادشاہ کی تسلی کے لئے رمّالوں۔ نجومیوں جوتشیوں کو بلوایا اور ان سے دریافت کیا کہ تاج و تخت کا وارث پیدا ہونے کی کب تک امید ہے۔ اُن سب نے بالاتفاق کہا کہ بادشاہ کی تقدیر میں ایک فرزند ہے اور خوشی کا دور جلد آنیوالا ہے۔ پنڈتوں نے جنم پتر ادیکھ کر حکم لگایا کہ "چندرمان سا بالک ترے ہوئیگا" لیکن بارھویں سال میں نظر کا ڈر ہے اسلئے بارہ برس تک یہ چودھویں کا چاند محل سے باہر نہ نکلے اور کوٹھے پر نہ چڑھے۔ بادشاہ کو ڈھارس ہوئی۔ سلطنت چھوڑنے کا قصد فسخ کیا اور خدا کی قدرت سے اُسی سال شاہی محل میں ایسا خوبصورت لڑکا پیدا ہوا کہ "اُسے دیکھ بیتاب ہو آفتاب" شہزادہ کا نام بے نظیر رکھا گیا۔ بادشاہ نے جانماز بچھا کر شکرانے کے سجدے کئے۔ مبارک سلامت کے شادیانے بجے امیر و وزیر۔ رئیس و فقیر نذریں لیکر بادشاہ کی خدمت میں مبارکباد کے لئے حاضر ہوئے۔ ہر ایک کو اس کی حیثیت کے مطابق انعام تقسیم ہوا۔

دئے شاہ نے شاہزادے کے ناؤں مشایخ کو اور پیرزادوں کو گاؤں
امیروں کو جاگیر۔ لشکر کو زر وزیروں کو الماس و لعل و گہر
خواصوں کو فوجوں کو جوڑے دئے پیادے جو تھے اُن کو گھوڑے دئے

مبارک سلامت کی دھوم دھام چھٹی تک رہی۔ شاہزادہ محل میں پلنے لگا۔ مکتب میں بٹھانے کا وقت آیا تو ہر فن کے اُستاد اس کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے اور اس کو وہ تمام علوم و فنون پڑھائے سکھائے گئے جو آصف الدولہ کے عہد میں شریفوں اور رئیسوں کے یہاں رائج تھے

جب بارھویں سال کی گرہ پڑی اور پنڈتوں کی بتائی ہوئی خطرہ کی مدت ٹل گئی تو دارالسلطنت آراستہ کیا گیا۔ شہزادہ حمام میں نہا کر اور شاہی لباس پہنکر بڑی دھوم سے شہر کی سیر کو نکلا۔ چار گھڑی کے بعد محل میں واپس آیا۔ شام ہو چکی تھی چودھویں رات کا چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی کی بہار دیکھنے کے لئے کوٹھے پر پلنگ بچھنے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے یہ سمجھ کر کہ سختی کے دن گزر چکے ہیں اور اب چھت پر آرام کرنے میں کچھ خطرہ نہیں ہے اجازت دی۔ شہزادہ بچھونے پر آتے ہی سو گیا۔

وہ پھولوں کی خوشبو وہ ستھرا پلنگ جوانی کی نیند اور سونے کا رنگ

تھوڑی دیر میں چوکی پہرے والوں کو بھی نیند آگئی اور ہر طرف سناٹا ہو گیا۔ اتفاقاً اُس طرف سے ماہرخ نام ایک پری کا گزر ہوا۔ شاہزادے پر نظر پڑی اور اس کے حسن و جمال پر ہزار جان سے عاشق ہو گئی۔ اپنا ہوائی تخت پلنگ کے قریب لائی۔ شاہزادے کو اُڑا کر پرستان لے گئی۔ پری کے طلسمی باغ میں شاہزادے کی آنکھ کھلی تو اجنبی جگہ دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ پہلے خیال ہوا کہ خواب ہے

زبس تھا وہ لڑکا تو سہما بھی کچھ ہوا کچھ دلیر اور حیراں بھی کچھ

سرہانے پری کو دیکھ کر پوچھا کہ تو کون ہے اور یہ گھر کس کا ہے؟

پری نے منہ پھیر کر جواب دیا:-

خدا جانے تو کون ؟ میں ہوں کہاں ! مجھے بھی تعجب ہے میں ہوں جہاں،
یہ گھر گو کہ میرا ہے تیرا نہیں، پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں
چھڑا کر ترا تجھ سے شہر و دیار یہ بندی ہی لائی ہے تقصیر وار

شہزادہ مجبور تھا۔ پری کی قید سے رہائی کی کوئی صورت نہ تھی۔ دل کو جوں توں لگایا وہاں۔ اور جو کچھ پری نے کہا منظور کیا۔ شہزادے کے والدین بیٹے کے یکایک گم ہونے سے اِدھر اُدھر تباہ حال اور بدحواس تھے۔ اِدھر شاہزادہ وحشیوں کی طرح اُداس رہتا تھا۔

بہانے سے دن رات سویا کرے نہ ہو جب کوئی تب وہ رویا کرے

ماہ رخ شہزادے کا جی بہلانے کی لاکھ کوشش کرتی مگر اس کو والدین کی شفقت اور گھر کی دلچسپیاں نہ بھولتی تھیں ایک مدت اسی حال میں گزری اور دل کی کلی نہ کھلی تو پری نے شاہزادے کو ایک طلسمی گھوڑا دیا جو کل کے اشارہ سے ہوا پر چلتا تھا اور اجازت دی کہ وہ اس پر چڑھکر روزانہ ایک پہر تک روئے زمین کی سیر کر آیا کرے۔ سہ پہر کو پری اپنے باپ کی خدمت میں جاتی تھی اس وقت شاہزادہ طلسمی گھوڑے پر چڑھکر دنیا کی سیر کو نکلتا تھا اور پہر بھر ہوا کھا کر پرستان میں واپس آجاتا تھا۔ تقریباً تین سال اسی حال میں گزرے۔ ایک رات اس کا گزر ایک باغ کی طرف

ہوا حسیں سفید رنگ کی ایک بلند عمارت بنی ہوئی تھی۔

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جابجا وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا

شاہزادے کو باغ کا منظر بہت پسند آیا۔ گھوڑے سے اُترا اور دبے پاؤں باغ میں آیا۔ ایک طرف چند گنجان درخت لگے تھے اُن کی آڑ سے جھانکنے لگا۔ صحنِ باغ میں فرش بچھا تھا اور مسند پر ایک نہایت حسین و صاحبِ جمال شہزادی بیٹھی تھی۔ اِدہر اُدھر خواصیں کھڑی تھیں اور ستاروں کی طرح چاند کو حلقہ میں لئے تھیں۔ شہزادہ یہ سماں دیکھ رہا تھا کہ ایک خواص کی نظر اُس پر جا پڑی۔ غل شور ہوا شہزادی کو خبر ہوئی کہ کوئی شخص درختوں میں چھپا ہے وہ بھی سہیلیوں کے ساتھ اُس طرف گئی۔ دیکھا کہ ایک حسین نوجوان درختوں کی آڑ میں سج دھج سے کھڑا ہے۔ (ڈیڑھ سو برس پہلے لکھنؤ کے رئیس زادوں کا فیشن دیکھئے:۔

گلے میں پڑا نیمہ شبنم کا ایک بدن سے عیاں نور عالم کا ایک
طرحدار اک سر پہ پھنیا سجا تمامی کا پٹکا کمر سے بندھا،
جواہر کا تکمہ گلے میں لگا ستارہ ہو جوں صبح کا جگمگا
اک الماس کی ہاتھ انگشتری سراسر حنا دست و پا میں لگی)
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن جوانی کی راتیں مُرادوں کے دن

حسن و جمال دیکھکر خواصیں عش عش کرنے لگیں اور شہزادی عشق کے دیوتا کا شکار ہوگئی۔ اس نازنین کا نام بدرمنیر تھا سراندیپ کے بادشاہ کی لڑکی تھی اور اس باغ میں سیر تماشے کو آیا کرتی تھی۔ بادشاہ کے وزیر کی بیٹی اُس کی ایک سہیلی نجم النساء نام تھی۔ اُس نے عاشق و معشوق کو بیہوش دیکھ کر گلاب چھڑکا۔ شہزادی کو ہوش آیا تو دالان میں جاکر چھپ رہی۔ (وزیرزادی نے بہلا پھسلا کر راضی کیا کہ وہ مہمان کی خاطرداری کرے:۔

کیا ہے اگر تو نے گھائل اُسے تو مت چھوڑ اب نیم بسمل اُسے
کہاں یہ جوانی کہاں یہ بہار یہ جوبن کا عالم رہے یادگار
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں، گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں)

نجم النساء شہزادے کو خلوت میں بلا لائی اور بدرمنیر کو ہاتھ پکڑ کر اُس کے قریب بٹھا دیا۔

(وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے بدن کو چُرائے ہوئے ناز سے
منہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے)

تھوڑی دیر تک حجاب رہا۔ اُس کے بعد شراب کے دور چلے اور عاشق و معشوق میں محبت پیار کی باتیں ہونے لگیں۔ شہزادے نے اپنا حسب نسب ظاہر کیا۔ ماہرخ پری کے پاس اپنی گرفتاری کا حال سنایا اور یہ بھی

کہدیا کہ ایک پہر سے زیادہ غیر حاضری کی اُس کو اجازت نہیں ہے۔ اسی گفتگو میں پہر بھر رات گزر گئی اور شہزادہ دوسرے دن اسی وقت آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوا

سماں شب کا آنکھوں میں چھایا ہوا — مزہ دل میں سارا سمایا ہوا
نئی بات کا لطف پانا غضب — وہ پہلے پہل۔ دل لگانا غضب

ہجر کا دن رو رو کر کٹا اور شام کو فلک سیر گھوڑے پر سوار ہو کر پھر بدر منیر کے باغ میں پہونچا اور ایک پہر رات گئے تک اپنے معشوق کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول رہا۔

اب معمول ہو گیا کہ ہر روز شام کو بدر منیر کے باغ میں جاتا اور پہر رات تک ہنس بول کر پری کے طلسمی باغ میں واپس چلا جاتا۔

ایک دن کسی دیو نے شہزادے کو بدر منیر کے پاس دیکھ لیا اور ماہرخ کو خبر کر دی۔ وہ غصہ میں بھری بیٹھی تھی کہ شہزادہ پہونچا۔ اُس کو دیکھتے ہی برس پڑی۔

تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا — کہ اُس مالزادی کو جوڑا دیا
پھر اسپ جیسے راتوں کو دلشاد تو — کرے گا دنوں کو بہت یاد تو

اور ایک دیو کو حکم دیا کہ شہزادے کو جنگل کے اس کنوئیں میں قید کر دے جس پر کئی من کا پتھر رکھا ہوا ہے۔

سر شام کھانا کھلانا اسے — اور اک جام پانی پلانا اسے
نہ دیکھو سوا اس کے جو کچھ کہے — یہی اس کا معمول دائم رہے

دل سے دل کو راہ ہوتی ہے اُدھر شہزادہ کنوئیں میں قید ہوا اور یہاں بدر منیر کے دل کو بے چینی شروع ہوئی جب کئی دن گزرے اور شہزادہ نہ آیا تو بدر منیر بیقرار ہو گئی۔

دوانی سی ہر طرف پھرنے لگی، — درختوں میں جا جا کے گرنے لگی،
خفا زندگانی سے ہونے لگی، — بہانے سے جا جا کے سونے لگی،
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا — نہ کھانا نہ پینا نہ کپڑے کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے — محبت میں دن رات گھٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو — تو اُٹھنا اُسے کہہ کے ہاں جی چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے — تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی — یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے، — کہا خیر بہتر ہے منگوائیے،

جو پانی پلانا تو پینا اسے غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے
غزل یا رباعی دیا کوئی فرد اسی ڈھب کی پڑھنا کہ ہو جس میں درد
سو یہ بھی جو مذکور نکلے کہیں نہیں تو کچھ اس کی بھی خواہش نہیں
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

ایک دن باغ میں پریشان بیٹھی راہ تک رہی تھی کہ گانا سننے کو جی چاہا اور عیش بائی ڈومنی کو مجرے کا حکم دیا گیا۔ ڈومنی کی آن بان دیکھئے:۔

لٹیں منہ پہ چھوٹی ہوئی سر بسر کہ بدلی ہو جوں سر کے ادھر اُدھر
وہ بن پونچھے ہونٹوں کی مسی غضب کہ منہ پر تھی گویا قیامت کی شب
فقط کان میں ایک بالا پڑا کہے تو کہ تھا مہ کے ہالا پڑا
بندھا سر پہ جوڑا پڑی زرد شال کمر کی لچک اور مٹک کی وہ چال
وہ بشواز اگری و نرگس کے ہار وہ کم خواب کے
وہ اُٹھی ہوئی چین پشواز کی، وہ مسکی ہوئی چولی انداز کی
وہ مہندی کا عالم وہ توڑے چھڑے وہ پاؤں میں سونے کے دو دو کڑے
چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی
وہ آنے لگی کافر اس آن سے کہ جانے لگا جی مسلمان سے

موسم موافق تھا اور وقت مناسب گانے کا سماں بندھ گیا:۔

گھڑی چار دن باقی اُسوقت تھا سہانا ہر اک طرف سایہ ڈھلا
درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ وہ دھانوں کی سبزی یہ سرسوں کا روپ
وہ رقصِ بتاں اور ستہری الاپ وہ گوری کی تانیں وہ طبلہ کی تھاپ
وہ دل پینا ہاتھ پر دھر کے ہاتھ اُچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ
غرض جو کھڑے تھے کھڑے رہ گئے اڑے جس جگہ تھے اڑے رہ گئے

راگ سے پتھر کا جگر پانی ہوتا ہے۔ چرند و پرند۔ انسان و حیوان۔ جن و پری سب کا حال غیر ہو گیا۔ بدرمنیر کا دل گھائل تھا وہ آہیں کھینچنے لگی۔ دیر تک آنکھوں پر رومال رکھکر روتی رہی اور اس کے بعد چھپر کھٹ پر جا گری۔ مجلس برخاست ہوئی مگر بدرمنیر کا حال دن پر دن بدتر ہونے لگا۔

نہ منہ کی خبر اور نہ تن کی خبر نہ سر کی خبر نے بدن کی خبر

اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں، جو کُرتی ہے میلی تو محرم نہیں
جو مسی ہے دو دن کی تو ہے وہی، جو کنگھی نہیں ہے تو یونہی سہی
نہ منظور سرمہ نہ کاجل سے کام نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام

غرض جب ہجر نے لیلےٰ کو مجنوں بنا دیا تو ایک رات خواب میں دیکھا کہ لق و دق جنگل میں کنواں ہے اور کنوئیں کے مُنھ پر کئی لاکھ من کی سِل رکھی ہے اور وہاں سے آواز آتی ہے کہ اے بدرمنیر مجھکو تیری جدائی کا غم ہے

میں بھولا نہیں تجھکو اے میری جاں کروں کیا کہ ہے مجھپہ قیدِ گراں
کوئی دم کا مہمان ہوں آج کل اسی چاہ میں جائے گا دم نکل

بدرمنیر نے جواب دینا چاہا مگر یکایک اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ جاگی تو نہ وہ کنواں تھا نہ وہ آواز۔ خود باؤلی ہو رہی تھی۔ نجم النسا نے یہ قصہ سُنا تو جوگن کا بھیس بنا کر شہزادے کو ڈھونڈھنے نکلی۔ رخصت کے وقت بدرمنیر رونے لگی :-

وہ رو رو کے دو ابر غم یوں ملے کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے

شہروں شہروں جنگل جنگل پھرتی اور شہزادے کا نشان ڈھونڈھتی تھی لیکن کہیں پتہ نہ چلتا تھا۔ ایک رات جنگل میں مرگ چھالا بچھائے اکتارا بجا رہی تھی۔ جنوں کے بادشاہ کا لڑکا فیروزشاہ نام اُدھر سے گزرا اور جوگن کی صورت دیکھتے ہی عاشق ہو گیا

یہ سمجھا بناوٹ کا کچھ بھیس ہے لگا کہنے جوگی جی آدیس ہے

جوگن نے بھی نظر پہچان لی

کہا ہنس کے جوگن نے ہر بول ہر جہاں سے تو آیا چلا جا اُدھر

کچھ دیر باہم لطیفے ہوئے اور اس کے بعد پریزاد کے اصرار سے جوگن نے بین بجانا شروع کی۔ رات بھر بین بجاتی رہی اور فیروز سُنتا رہا۔ صبح کے وقت جوگن نے بین کاندھے پر رکھی۔ پریزاد نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر ہوائی تخت پر بٹھایا اور پرستان لے گیا۔ چند روز تک مہمان رکھا اور مطلب کی بات زبان پر نہ لایا۔ مگر جب دل بے قابو ہو گیا تو ایک دن قدموں پر گر پڑا۔ جوگن نے کہا کہ تم میرے مطالب برلاؤ تو اپنی مراد بھی پاؤ۔ شہزادی بدرمنیر کی عاشقی کا قصہ۔ پری کی محبت اور بے نظیر کے قید کئے جانے کا حال بیان کر کے فیروزشاہ سے کہا کہ تم شہزادے کا پتہ چلاؤ تو تمہارا مقصود بھی حاصل ہو۔ فیروزشاہ کے حکم سے پرستان میں ہر طرف شہزادے کی تلاش ہونے لگی۔ ایک خادم کا اس کنوئیں کی طرف گزر ہوا جہاں بے نظیر قید تھا۔ معلوم ہوا کہ ماہرخ پری کا قیدی ہے۔ فیروزشاہ نے ماہرخ کو ڈرا دھمکا کر بے نظیر کو قید سے نجات دلوائی اور دوسرے دن ہوائی تخت پر بٹھا کر نجم النسا اور بے نظیر کو

بدرمنیر کے باغ میں پہونچا دیا۔ عاشق کی معشوق سے ملاقات ہوئی اور بدرمنیر کے تن بیجان میں جان آئی۔

چند روز کے بعد بدرمنیر اپنے ماں باپ کے گھر گئی شہزادہ بے نظیر کی طرف سے شادی کا رقعہ اس کے باپ کے پاس بھیجا گیا۔ پیام منظور ہوا اور بڑے دھوم دھام سے بے نظیر اور بدرمنیر کی شادی ہوئی۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ کی براتیں دیکھنا ہو تو مثنوی میر حسن میں بیاہ کی داستان پڑھنا چاہئے مگر اس مختصر مضمون میں اس تفصیل کی گنجایش نہیں۔ بعد ازاں نجم النسا اور فیروز شاہ کی شادی ہوئی وہ دونوں شاد و خرم پرستان کو رخصت ہوئے اور بے نظیر اپنی دلہن کو لیکر ماں باپ کی خدمت میں وطن آیا۔ والدین کی آنکھوں میں نور آیا۔ یعقوب ثانی نے یوسف پایا۔

الٰہی سب کے بچھڑے جیسے دن ہمارے تمہارے پھریں ویسے دن
ملیں سب کے بچھڑے الٰہی تمام بحق محمد علیہ السلام،

امیر احمد علوی (بی۔اے)

پبلک سروس کمیشن - صوبجات متحدہ

ضرورت ہے

۲۴۳ / ۶۰۴۷ - ۳۸

حکومت صوبجات متحدہ کی ترقی دیہات کی اسکیم کے سلسلہ میں ۱۴۶ ایورویدک اور ۴۶ یونانی دواخانے جاری کئے جانے والے ہیں۔ ان کے لئے اتنے ہی ویدوں اور اطبا کی ضرورت ہے۔ ایسے ویدوں اور اطبا کا تقرر فی الحال ۶ ماہ کے لئے ہوگا ممکن ہے کہ آئندہ اور توسیع ہو۔ امیدواران کو صوبجات متحدہ یا ریاست ہائے رامپور و بنارس و ٹہری (گڑھوال) کا مستقل باشندہ ہونا ضروری ہے۔ تنخواہ ۳۵ - ۵ - ۶۵ روپیہ ماہوار۔ اس کے علاوہ ۱۰ روپیہ ماہوار متعین شدہ الاؤنس دورہ کے اخراجات کے لئے یہ مشاہرہ عارضی ہے اور اس میں مزید تخفیف ممکن ہے۔ امیدوار کو بورڈ آف انڈین میڈیسن صوبجات متحدہ (Board of Indian Medicine U.P.) کے درجہ الف (A Class) کا رجسٹرڈ وید یا طبیب ہونا ضروری ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے ایورویدک کالج اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے طبیہ کالج کے سند یافتہ امیدواران کو ترجیح دیجائے گی۔ امیدواران کی عمر یکم دسمبر ۱۹۳۸ء کو عموماً ۲۵ اور ۴۵ سال کے درمیان ہونی چاہئے۔ درخواستیں ۵ دسمبر ۱۹۳۸ء تک داخل ہو جانی چاہئیں۔ درخواست کا مجوزہ فارم اور مزید اطلاعات سکریٹری صاحب پبلک سروس کمیشن صوبجات متحدہ۔ الہ آباد سے درخواست کرنے پر دستیاب ہو سکتے ہیں۔

الہ آباد - ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء

سیاسیات یوروپ

(۹)

ڈی ولیرا

اس وقت جتنے ڈکٹیٹر حکمراں ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو بیرون ملک کے باشندے ہیں اور انھیں میں سے ایک ڈی ولیرا بھی ہے۔ ہٹلر آسٹریا میں پیدا ہوا پلسڈسکی (پولینڈ کا حکمران) لتھونیا کا باشندہ ہے، اسٹالین جارجیا کا رہنے والا ہے اور کمال اتاترک، سلونیکا (یونان) میں پیدا ہوا تھا۔ جب کمال اتاترک بچہ تھا تو سالونیکا، سلطنت ترکی ہی میں شامل تھا، ریوا بھی اسی طرح آسٹریا کا حصہ تھا جب شوشنگ اسکول میں تعلیم پاتا تھا، لیکن ڈی ولیرا کی جائے پیدائش تو اس کے پایۂ تخت سے تین ہزار میل دور واقع ہے۔

یہ ۱۸۸۲ء میں بمقام نیویارک پیدا ہوا۔ اس کا باپ اسپین کا رہنے والا تھا لیکن ہجرت کر کے امریکہ چلا گیا تھا اس کی ماں بیشک آئرلینڈ کی رہنے والی تھی لیکن وہ بھی امریکہ چلی گئی تھی، الغرض ڈی ولیرا اپنی پیدائش کے لحاظ سے امریکن تھا، اور اسی چیز نے فی الحقیقت اس کی جان بچائی۔ کیونکہ جب ۱۹۱۶ء میں آئرلینڈ کے اندر بغاوت ہوئی، اور باغی سرداروں کو برطانوی فوجی عدالت سے قتل کی سزائیں دیجانے لگیں تو ڈی ولیرا سزائے موت سے صرف اس سے بچگیا کہ وہ امریکہ کا باشندہ تھا اور یہ کچھ مناسب نہیں سمجھا گیا کہ امریکہ کو شکایت کا موقع دیا جائے۔ اگر اتفاق سے ڈی ولیرا امریکن نہ ہوتا تو اسوقت آئرلینڈ کی تاریخ کسی اور طرح مرتب کی جاتی اور ہوسکتا ہے کہ وہ بدستور غلام بنا رہتا۔

دنیا میں ایسے سیاسی رہنما بہت کم ہوئے ہیں جن کو دنیا اُن کے پیار کے نام سے پکارتی ہو، لیکن آئرلینڈ میں ہر شخص ڈی ولیرا کو ڈیو ہی کے نام سے پکارتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملک میں کتنا ہر دلعزیز ہے اور لوگ اس سے کتنی محبت کرتے ہیں

وہ ٹھیک ساڑھے نو اور دس کے درمیان صبح کو دفتر آجاتا ہے اور سب سے پہلے وہ ان محکموں کے تمام افسروں سے گفتگو کرتا ہے جو براہ راست اس کی نگرانی میں ہیں اور ایک ایک بات کو نہایت تفصیل کے ساتھ سمجھتا ہے وہ دوپہر کا کھانا کھانے گھر جاتا ہے اور پھر فوراً دفتر واپس آجاتا ہے اور شام کو ۶ بجے تک کام کرتا رہتا ہے، اس کے بعد چائے پینے گھر جاتا ہے اور اکثر و بیشتر پھر پلٹ آتا ہے۔ آدھی رات کو دفاتر حکومت کی عمارتوں کے پاس سے گزرنے والے اکثر دیکھتے ہیں کہ پریسیڈنٹ کے کمرہ میں روشنی ہو رہی ہے۔ وہ سوائے اس صورت کے کہ بیمار پڑ جائے کبھی تعطیل نہیں مناتا اور نہ چھٹی لیتا ہے۔ وہ نہایت مضبوط گٹھے ہوئے جسم کا انسان ہے۔ نہایت اچھا شہسوار ہے اور تقریباً ہر اتوار کو وہ ڈبلن سے دس میل کے فاصلہ پر پہاڑیوں پر چڑھنے اترنے کی ورزش میں مصروف دیکھا جاتا ہے، ڈرائیور موٹر کو آہستہ آہستہ لیجاتا ہے اور وہ موٹر کے پیچھے پیچھے برہنہ سر تیز قدموں سے پیدل چلتا رہتا ہے۔ وہ اتنا تیز رفتار ہے کہ اس کے اعزہ و احباب کوئی اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس کے ساتھ آٹھ محافظ خفیہ پولیس کے بھی رہتے ہیں لیکن وہ اسے گھیرے نہیں رہتے بلکہ پیچھے پیچھے چلتے ہیں، وہ ہمیشہ سیاہ لباس استعمال کرتا ہے اور برانڈی یا وہسکی کبھی نہیں پیتا، اب وہ تمباکو بھی نہیں استعمال کرتا حالانکہ ۱۹۲۰ء میں وہ اس کا بڑا شایق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت بغاوت کے سلسلہ میں وہ گرفتار کیا گیا تو پائپ پی رہا تھا۔ اس نے فوراً اسے ہاتھ سے پھینک دیا اور ہمیشہ کے لئے تمباکو پینا چھوڑ دیا

جب تک اس کی بینائی اچھی رہی وہ کتابوں کے مطالعہ کا بڑا شایق تھا، لیکن اب اسے شطرنج، ریڈیو اور ریاضی سے بہت دلچسپی ہے۔ اس کی بیوی شادی سے قبل اس مدرسہ میں ملازم تھی جہاں ڈی ولیرا پڑھتا تھا، بعد کو ۱۹۰۱ء میں اسی سے شادی ہوگئی اور سات بچے ہوئے۔ ڈی ولیرا اپنی بیوی بچوں سمیت ایک نہایت سادہ اور معمولی مکان میں رہتا ہے۔ ان کے پاس صرف ایک ملازم ہے اور ایک خادمہ۔ ۱۹۳۲ء سے قبل وہ اس سے بھی زیادہ مختصر مکان میں رہتا تھا اور نوکر بھی کوئی نہ تھا، سارا کام میاں بیوی خود اپنے ہی ہاتھ سے کرتے تھے

ڈی ولیرا لوگوں سے ملنے میں بہت فراخدل ہے اور بکثرت لوگ اس سے ملنے آتے ہیں، اس کے احباب بھی بہت ہیں لیکن عورتوں کی صحبت سے وہ اجتناب کرتا ہے۔ اسے روپیہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اس نے عہدۂ صدارت قبول کرنے پر اپنی تنخواہ گھٹا کر ۲۵۰۰ پونڈ سے ۱۵۰۰ پونڈ کر دی۔ ذاتی ذریعۂ معاش اس کا کوئی نہیں ہے اور نہ وہ تعیش کا عادی ہے، موسیقی کا البتہ بہت شایق ہے اور مذہب کا بھی پابند ہے۔ ہنسی مذاق سے اسے دلچسپی نہیں لیکن جب ہنستا ہے تو دل کھول کر ہنستا ہے۔ وہ بڑا ضابط، متحمل اور سنجیدہ ہے، جذبات سے بہت کم مغلوب ہوتا ہے، جب وہ کسی پبلک جلسہ میں شریک ہونے جاتا ہے تو وہ نہ مسکراتا ہے، نہ سر کے اشارے سے لوگوں کے خیر مقدم کو قبول کرتا ہے، وہ سیدھا چلا جاتا ہے اور ایسے انداز سے گویا یہاں کوئی آدمی موجود ہی نہیں ہے۔

ڈی ولیرا کی عمر دو سال کی تھی کہ اس کے باپ کا انتقال ہوگیا اور اسے اس کا ماموں امریکہ سے آئرلینڈ لے آیا اس کی ماں وہیں امریکہ میں رہ گئی اور کسی اور سے شادی کرلی۔ ڈی ولیرا کی تعلیم ننہیال ہی میں ہوئی اور رائل یونیورسٹی سے نکل کر کسی مدرسہ میں معلم ہوگیا اور یہیں سے اس کی انقلاب انگیز زندگی شروع ہوئی۔

اس وقت یورپ کے اکثر ممالک میں ڈی ولیرا کی ذہنیت کے نوجوان پائے جاتے ہیں لیکن اس کی سی خصوصیات کسی میں نہیں پائی جاتیں۔ یہ ابتدا ہی سے بہت زیادہ انتہا پسند تھا جسوقت پیرس، میکڈف، میکڈرماٹ نے آئرلینڈ میں جمہوریت کا اعلان کیا تو یہ وہ وقت تھا کہ کامیابی کی کوئی امید نہ تھی اور اس تحریک میں حصہ لینا گویا خودکشی کرنا تھا لیکن ڈی ولیرا ان لوگوں کے ساتھ شریک ہوگیا۔ یہ تحریک ایک ہفتہ کی جنگ کے بعد ختم ہوگئی اور تمام لیڈر قتل کئے گئے ڈی ولیرا محض امریکن ہونے کی وجہ سے بچ رہا۔ اس کے بعد وہ بغاوت رونما ہوئی جو ایسٹر بغاوت (Easter Rebellion) کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ڈی ولیرا نے باقاعدہ انگریزی فوجوں کا مقابلہ کیا اور بغاوت فرو ہونے کے بعد بھی اظہار اطاعت نہیں کیا۔ فوجی عدالت نے اس کو سزائے موت کا حکم دیا لیکن چونکہ اسوقت برطانیہ متوقع تھا کہ امریکہ بھی ان کے ساتھ جنگِ عظیم میں حصہ لیگا، اس لئے ڈی ولیرا کو قتل نہ کیا گیا بلکہ حبس دوام کی سزا تجویز کی گئی۔ یہ ایک سال تک ڈارٹمور میں قید رہا تھا کہ ۱۹۱۷ء میں عام صلح کا اعلان ہوا اور اس سلسلہ میں وہ چھوڑ دیا گیا لیکن ۱۹۱۸ء میں پھر گرفتار کرکے لنکن جیل بھیج دیا گیا۔ یہاں سے وہ اپنے دوستوں کی مدد سے بھاگا اور منچسٹر آکر ایک پادری کے مکان میں اس نے پناہ لی، یہاں سے وہ لیورپول گیا اور پھر آئرلینڈ پہونچا۔ ہر چند اسکی گرفتاری کے لئے تمام ملک میں خفیہ پولیس والے دوڑتے پھرتے تھے لیکن وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ پھر یہ امریکہ گیا اور وہاں سے لوگوں کی ہمدردی حاصل کرکے آئرلینڈ کی آزادی کے لئے کچھ فنڈ فراہم کیا اور بڑی دشواریوں سے ۱۹۱۹ء میں آئرلینڈ پہونچا۔

اس کے بعد آزادی آئرلینڈ تک جو زمانہ بسر ہوا، وہ نہایت خوفناک قسم کی کاوش کا تھا، اور بارہا مایوسیوں کا سامنا اُسے ہوا، لیکن وہ برابر کوشش میں لگا رہا اور آخر کار اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے قومی مجلس (نیشنل اسمبلی) قائم کرلی اور بادشاہ کی اطاعت کا حلف اُٹھانے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد جو خانہ جنگی وہاں شروع ہوئی وہ تاریخ آئرلینڈ کا نہایت اہم واقعہ ہے لیکن ڈی ولیرا برابر دلیرانہ مقابلہ کرتا رہا اور جولائی ۱۹۲۱ء میں حکومت برطانیہ اسپر آمادہ ہوئی کہ آئرلینڈ کو ڈومی نین ہوم رول دیدیا جائے، لیکن صوبۂ السٹر کو اس سے علٰحدہ رکھا جائے، ڈی ولیرا نے اسکی مخالفت کی اور پھر جنگ شروع ہوگئی۔ ۱۹۲۲ء میں یہ خونریزی پھر ختم ہوئی اور کاسگریو کی صدارت میں یہاں حکومت قایم کی گئی۔ کاسگریو نے لائڈ جارج کے پیش کردہ شرائط کو منظور کرکے عہدنامہ پر دستخط کرنا چاہے لیکن ڈی ولیرا نے اس کی مخالفت کی اور ہر چند اسکی جماعت اقلیت میں تھی لیکن بعد کو ۱۹۳۲ء میں لیبر پارٹی کے اتحاد سے اس نے کاسگریو گورنمنٹ کو توڑ دیا اور خود برسر اقتدار ہوکر اسوقت تک چین سے نہ بیٹھا جب تک اس نے آئرلینڈ کو پوری طرح آزاد نہ کرالیا۔

مکتوبات نیاز

جناب ڈپٹی صاحب

کل اتفاق سے وہ راستہ میں ملگئے، جن سے آپ خفا ہیں۔ میں آپ سے سفارش تو نہیں کرتا، لیکن یہ ضرور پوچھوں گا کہ جس سے آپ برہم ہو جاتے ہیں وہ کیوں اسدرجہ خوار ہو جاتا ہے۔ سچ ہے

تو پوچھتا نہیں، تو کوئی پوچھتا نہیں

مجھے اُن سے صرف اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی غالب کو "اصنام" سے، کہ نہ وہ اُنھیں "آوارۂ غربت" دیکھ سکتا تھا اور نہ میں اِن کو۔ میں نے اُسوقت تو کوئی ذکر مناسب نہیں سمجھا، لیکن آج صبح وہ آئے تو میں نے پوچھا غریب آنسو بھر لائے۔ مجھ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے میں آپ سے متنفر ہو گیا اور کوشش کی کہ انھیں بھی باغی بنا دوں، لیکن کامیاب نہ ہوا۔ بہرحال اگر غلطی کا اعتراف کوئی معنی رکھتا ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ سراپا "اعتراف" ہیں اور ہر اُس سزا کے قبول کرنے کے لئے طیار جو ایک محبت کرنے والے کی طرف سے دوسرے محبت کرنے والے کو دیجا سکتی ہے۔ پھر اگر "کافر" و "گناہگار" میں کوئی فرق ہے تو تعزیریں بھی ہونا چاہئے۔ بہرحال میں نے اُن کو روک لیا ہے وہ میرے ہی پاس ٹھیرے ہوئے ہیں۔ آپ اُن سے ناخوش ہوں تو ہوں، میں نہیں ہوں اور جانتا ہوں کہ آپ کی برہمی بھی زیادہ پایدار نہیں۔ یہ عریضہ صرف اس لئے بھیج رہا ہوں کہ آپ کو حالات کا علم ہو جائے اور کوئی مقصود نہیں

مشفقی — آپ کی بیکاری کا حال سُنکر افسوس ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کی ذمہ داریاں عرصہ تک اس کو برداشت نہیں کر سکتیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا علاج بھی کیا ہے۔ وہ زمانہ گزر گیا جب بندگی میں انسان کا بھلا ہوتا تھا اور خدا پر ہر مخلوق کا رزق پہونچانا فرض تھا۔ اب تو جبر و اختیار کی صورت صرف یہ رہگئی ہے کہ انسان بھوکا مرنے پر اختیار رکھتا ہے اور قدرت روزی مہیا کرنے پر مجبور نہیں۔ رہا ایک انسان کا مرنا یا جینا، سو اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب آپ چلتے ہیں تو سیکڑوں چیونٹیاں پامال ہو جاتی ہیں، لیکن

آپ کو خبر نہیں ہوتی - تو کیا خدا کو آپ اپنے برابر بھی بے نیاز ہونے کا حق نہیں دیتے - اگر خدا کا وجود ہے تو یقیناً انسان اس کے مقابلہ میں اس سے زیادہ فروتر ہے جتنی چیونٹی آپ کے مقابلہ میں

اس سے مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگر بیروزگاری کے باب میں آپ صرف خدا پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہے تو نتیجہ یقیناً تباہی ہے - جس سے کوئی باز پرس نہ ہو سکے اُس سے دور ہی رہنا بہتر ہے

افسوس ہے کہ نوکری کی عمر آپ کی رہی نہیں، اور ہوتی بھی تو ملتی کہاں ہے، اس لئے اس کی فکر تو آپ کیجئے نہیں - پیشہ اور کاروبار کی حالت بھی خراب ہے، لیکن بہرحال آبادی کا بڑا حصہ اسی پر زندگی بسر کر رہا ہے، اسلئے میری رائے میں اگر کسی چلتے ہوئے کارخانہ کی ایجنسی مل جائے تو بہتر ہے - ضمانت وغیرہ کی ضرورت ہوئی تو اسکا انتظام میں کر دوں گا

آپ میاں صاحب سے تو ملئے دیکھئے کیا کہتے ہیں

قبلہ شیخ صاحب

گرامی نامہ پہونچا - یقیناً نہ میں آپ کا سا تجربہ رکھتا ہوں، نہ آپ کی سی عقل و فراست، لیکن اسکا کیا علاج کہ مجھے اپنی ناتجربہ کاری و حماقت دونوں بہت عزیز ہیں کیونکہ وہ میری اپنی ہی ہیں

آج نہیں بلکہ ہمیشہ سے مجھ میں یہ عیب چلا آرہا ہے کہ جو کچھ دیکھوں اپنی آنکھ سے دیکھوں، اور جو کچھ سمجھوں خود اپنی فکر سے سمجھوں - پھر اس بدقسمتی کا کیا علاج کہ "گوشِ سخن شنو اور دیدۂ اعتبار" سے کوئی ایک چیز بھی فطرت کی طرف سے مجھے نہیں ملی

آپ کی محبت و ہمدردی میں کلام نہیں لیکن آپ مجھ ایسے سیہ بخت پر اس کا صرف بیجا کیوں کریں - آپ جس کے نام لیوا ہیں، اسی کا میں بھی ہوں - فرق صرف یہ ہے کہ آپ اس سے ڈرتے ہیں، میں محبت کرتا ہوں، اور محبت کرنے والے کو کبھی کبھی استغناء پیدا ہو ہی جاتا ہے

آپ نے مجھ سے زیادہ زمانہ دیکھا ہے اور یقیناً آپ بہتر جانتے ہیں کہ زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے، لیکن دنیا میں ایسے لوگ بھی کاہے گاہے پیدا ہو جاتے ہیں جو تماشائی نہیں بلکہ تماشہ بنکر جینا پسند کرتے ہیں - پھر کچھ تو فرق میرے اپنے درمیان رہنے دیجئے، خواہ وہ فرق فردوس و جہنم ہی کا کیوں نہ ہو

آخر کار آپ کی نظر مجھے کھا گئی نا! میں کہتا تھا کہ دیکھئے میری صحت پر رشک نہ کیجئے، آپ کی "نگاہ خارا شکن" بلائے بد ہے، لیکن آپ نہ مانے اور مجھے بیمار ڈالا - اس دوران میں، حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ اگر میں

آپ کی طرح دولت مند ہوتا تو وصیت نامہ وغیرہ بھی لکھ ڈالتا، لیکن قدرت کو شاید منظور تھا کہ آپ کے مقابلہ میں مجھے شکست ہو، اس لئے بچ گیا اور اب بالکل اچھا ہوں۔ اب سے ۶، ۷ ماہ قبل جب میں حیدر آباد گیا تھا تو وہیں سے بیمار آیا تھا اور میں کہ اپنی بدقسمتی سے واقف ہونے کی بنا پر ہر معاملہ کو انتہائی بدظنی کے ساتھ دیکھتا ہوں، سمجھ چکا تھا کہ یہ موت کا پہلا اور آخری اعلانِ جنگ ہے۔ دل و دماغ دونوں بیکار ہو چکے تھے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دفعتاً ایسا کیوں ہوا۔ میں اس کا قایل تو ہوں نہیں کہ موت کا وقت مقرر ہے اور کچھ کیجئے وہ اسوقت پر آئے گی ضرور، اس لئے تنہائی میں ان اسباب پر بھی غور کرتا جاتا تھا، جنھوں نے دفعتاً میری حالت کو اتنا متغیر کر دیا

حیدر آباد سے لکھنؤ واپس آنے کے بعد متعدد دورے مجھ پر پڑے اور رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ عمیق نفس سے سانس لینا دشوار ہو گیا اور قلب پر ہر وقت غیر معمولی دباؤ محسوس ہونے لگا۔ ڈاکٹروں نے دیکھا تو کہا کہ خون میں دباؤ ہے، نہ قلب کو کوئی آزار، لیکن پھر کیا ہے؟ اسے وہ خود بھی نہ سمجھ سکے۔ آخر کار میں نے خود اپنا علاج شروع کیا، یعنی اُن تمام فطری ذرایع پر غور کیا جو صحت انسانی کے لئے ضروری ہیں اور اپنی زندگی کا بالکل نیا پروگرام مرتب کیا، کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، سب کا اسلوب بدل دیا اور آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ ایک ہفتہ کے اندر حالت کچھ سے کچھ ہو گئی

میں اب اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ صحیح و توانا محسوس کرتا ہوں اور ایک خاص نشاط کی کیفیت اپنے اندر پاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ یہ سنکر کہیں گے کہ مجھے بھی یہ تدبیر بتاؤ لیکن اس وقت تک کبھی نہ بتاؤں گا جب تک آپ میری ہی طرح ایک بار بیمار پڑ کر نہ دکھا دیں۔ آپ کو کیا خبر کہ اس دوران میں کتنی تکلیف، کتنی روحانی اذیت مجھے پہونچی ہے اور اب اس کے ازالہ سے مجھے کتنی مسرت ہے — اتنی کہ میں آپ کو بتانا چاہوں بھی تو دفعتاً نہیں بتا سکتا

اب جو آپ آئیں، تو میرے لئے وہاں سے وہ تمام چیزیں لیتے آئیے گا جو انتہائی بدپرہیزی کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ ایک باریوں بھی امتحان کر کے دیکھنا ہے۔

مطلوب ہیں

نگار جنوری ۲۷ء - نومبر ۳۳ء - جنوری و اپریل تا دسمبر ۳۴ء - جون ۳۵ء - مئی و اگست ۳۶ء - فروری دسمبر ۳۷ء کے نگار کے پرچے جو صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں، دفتر کو اطلاع دیں۔

مینجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

ایچ۔جی ویلز اور اسلام

(ام۔اے۔انعام الٰہی صاحب۔کراچی)

آپ نے ایچ۔جی۔ویلز کی کتاب "شورٹ ہسٹری آف دی ورلڈ" ضرور دیکھی ہوگی اور "اسلام اینڈ محمد" کے زیر عنوان اس کے خیالات بھی پڑھے ہوں گے اور یہ بھی یقین ہے کہ آپ نے اگر اس کو بے انصافی کا نہیں تو بے خبری کا ملزم ضرور گردانا ہوگا، اگرچہ ایچ۔جی۔ویلز کا حضرت محمد اور اسلام کے صحیح حالات سے بے خبر ہونا تعجب خیز بات ہے۔

مسلمانوں نے اس کے جواب میں انڈیا ہاؤس کے سامنے مظاہرہ کیا اور اب ہندوستانی مسلم اخبارات اس کے خلاف بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔ ممکن ہے۔ یہ کوئی کارآمد صورت جواب کی ہو۔ اور کبھی اس سے فایدہ ہوا ہو اور اس موجودہ معاملہ میں بھی بفرض محال کامیابی ہو جائے۔ یعنی "دنیا کی مختصر تاریخ" میں سے "اسلام اور محمد" والے حصے خارج کر دئے جائیں۔

یہ واقعہ اور اس قسم کے صدہا واقعات روزانہ ہوتے رہتے ہیں۔ جن سے اسلام اور حضرت محمد کی توہین کا پہلو نکلتا ہے اور ان میں سے بعض پر مسلمان شور و غل بھی مچا لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض معاملوں میں کوئی مجاہد اسلام مجرم کو قتل تک کر دیتا ہے ـــ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس قسم کی کارروائیوں سے مسلمان کیا واقعی "اسلام" کی خدمت کرتے ہیں۔ کیا غیر مسلم اقوام کے دلوں میں اسلام اور حضرت محمد کی عزت اس قسم کی حرکتوں سے بڑھ جاتی ہے؟

برائے کرم بسلسلہ استفسار و جواب اس معاملہ پر اپنے خیالات کا اظہار کریں کہ غیر مسلم اقوام کی طرف سے "اسلام اور بانی اسلام" پر اس قدر خلاف حقیقت قسم کے حملے کیوں ہوتے رہتے ہیں ـــ اور پھر جب ہوتے ہیں تو وہ کونسا بہترین طریق جواب ہے جو مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیئے

(نگار) آپ کے استفسار کے دو ٹکڑے ہیں۔ ایک یہ کہ غیر مسلم مورخین و محققین کیوں غلط واقعات درج کر کے

اسلام و بانی اسلام کی توہین کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ جو طریقہ احتجاج کا مسلمان اختیار کرتے ہیں وہ مفید ہے یا نہیں۔

۱- غیر مسلم مصنفین دو قسم کے ہیں ایک وہ جو خود بھی کسی مذہب کے پابند ہیں اور دوسرے وہ جو کوئی مذہب نہیں رکھتے اور جنھیں آزاد خیال (Free Thinkers) کہتے ہیں۔ یقیناً ان دونوں کے زاویہ ہائے نگاہ میں فرق ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ وہ جماعت جو کسی مذہب کی پابند ہے اور کورانہ تقلید کے ساتھ پابند ہے، وہ تو قصد کر کے تعلیمات اسلام میں نقص نکالتی ہے اور سیرۃ نبوی و تاریخ اسلام کا مطالعہ صرف اس نکتہ چینی کی غرض سے کرتی ہے، اور اسے کرنا چاہیئے۔ اس عیب سے مسلمان بھی پاک نہیں، کیونکہ وہ بھی جب غیر مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیشہ انھیں باتوں کو اُبھارتے ہیں جو قابل اعتراض ہوتی ہیں

اب رہ گئی دوسری جماعت جو صرف تحقیق حق کی غرض سے مذہبی انتقاد کی طرف مایل ہے، اسکے متعلق یہ خیال کرنا کہ بالارادہ اسلام یا بانیِ اسلام کی توہین کرتی ہے، درست نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے مورخین کو اسلام کیا کسی مذہب سے بھی دلچسپی نہیں، لیکن کسی امر سے دلچسپی نہ ہونا اس کو مستلزم نہیں کہ اس کی مخالفت بھی کی جائے اور اس لئے ان کی مخالفت کو بغض و عناد سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا

افسوس ہے کہ خود مسلمانوں کی جماعت بھی اس باب میں انصاف سے کام نہیں لیتی اور چونکہ وہ اندھی تقلید میں مبتلا ہے اس لئے خود اس کو اپنے معائب یا اپنی کمزوریوں پر نگاہ ڈالنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ غیر مسلم لوگ جو اعتراضات اسلام پر کرتے ہیں یا نقائص سیرۃ نبوی میں نکالتے ہیں، ان کی بنیاد کیا ہوا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں یا جو کچھ نکالتے ہیں اس کا ماخذ اسلامی روایات ہی ہوتی ہیں، ایسا تو وہ کر نہیں سکتے کہ دوسرے مذاہب یا دوسری اقوام کی کتابوں سے استناد کرتے ہوں۔

"زنگیلا رسول" کا ماخذ بھی آپ ہی کا مذہبی لٹریچر تھا اور ٹسڈل نے جو انتقاد قرآن پر کیا ہے وہ بھی احادیث ہی کی بنا پر ہے۔ اس لئے فی الحقیقت قابل الزام تو خود ہمارے ہی جامعین احادیث، ہمارے ہی مفسرین قرآن اور ہمارے ہی مورخین اسلام ہیں جنھوں نے روایات کو پرکھے بغیر انھیں صحیح تسلیم کر لیا اور اس قدر انھیں رواج دیا کہ اسلام کا مفہوم سوائے اوہام پرستی و غیر عاقلانہ معتقدات کے اور کچھ نہ رہا

اب رہا ایسی تصانیف کے خلاف اس قسم کا احتجاج جیسا کہ عام طور پر رائج ہے، سو میری رائے میں اس سے زیادہ اظہار کمزوری کا مسلمانوں کی طرف سے اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ایک شخص رسول اللہ کے کیریکٹر کو بدنما ظاہر کرتا ہے تو ہمارا فرض صرف یہ ہے کہ اس کے استدلال کو غلط ثابت کریں۔ کسی کو مار ڈالنا یا جھنڈے اور جلوس نکالنا نہ کوئی منطقی استدلال ہے، نہ علمی حجت ہے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ آپ کو مذہب سے محبت ہے اور اس کے باب میں جان لینے اور جان دینے سے بھی احتراز نہیں کر سکتے لیکن اس طریق عمل سے

نہ آپ دوسروں میں اسلام کی محبت پیدا کر سکتے ہیں اور نہ اہل علم و عقل پر اس کی صداقت ثابت ہو سکتی ہے۔

اسوقت تک آریوں اور مشنریوں کی طرف سے بکثرت ایسی کتابیں شایع ہو چکی ہیں جن میں رسول اللہ کی سیرت کو داغدار اور قرآن مجید کو ناقص و نامکمل تصنیف ظاہر کیا گیا ہے اور ان سب میں اسی روایاتی لٹریچر سے مدد لی گئی ہے جو مسلمانوں کے یہاں مستند سمجھا جاتا ہے (مثلاً روایات بخاری وغیرہ) اس لئے جواب کی معقول صورت یہی ہو سکتی ہے کہ یا تو مسلمان خود اُن روایات کی تکذیب کریں یا اپنی کتابوں سے نکالدیں۔ لیکن یہ کام مولویوں کا ہے جو انھوں نے کبھی نہیں کیا اور نہ آیندہ کریں گے۔

پھر جب حالات یہ ہیں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ جب کوئی اس قسم کا الزام اسلام یا بانی اسلام پر قایم کیا جائے تو وہ مذہبی علماء سے جواب کا مطالبہ کریں پھر اگر انکا جواب معقول ہوگا تو دنیا خود اسے تسلیم کرلیگی اور اگر نہیں ہے تو یہ خود اپنی کمزوری ہے جس کو تیغ و خنجر یا شور و واویلا سے دور نہیں کیا جا سکتا۔

مسلمانوں کا یہ مجاہدانہ جذبہ کہ وہ ہر مخالف اسلام کے درپے آزار ہو جاتے ہیں، حد درجہ جاہلانہ و سفیہانہ جذبہ ہے اور اس سے مخالفین کو اور زیادہ یہ سمجھنے کا موقعہ ملتا ہے کہ اسلام کی تعلیم ہی خونریزی ہے اور خونریزی ہی سے اس کی اشاعت ہوئی ہے۔

تاریخ اسلام کا وہ واقعہ آپ کے سامنے ہوگا کہ عہد نامہ کی عبارت میں لفظ محمد کے بعد "رسول اللہ" کے الفاظ پر فریق ثانی اعتراض کرتا ہے اور آنحضرت خود اپنے ہاتھ سے اسے قلمزد کر دیتے ہیں۔ لیکن آج مسلمان کی ذہنیت یہ ہے کہ جو شخص محمد کو رسول اللہ نہ مانے وہ واجب القتل ہے۔ اسی سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ عہد نبوی کا اسلام کیا تھا اور آج کل کا اسلام کیا ہے

گزشتہ جنگ عظیم

(جناب کرم الٰہی صاحب۔ کانپور)

اہم تاریخی واقعات اور جغرافی معلومات کو نہایت مختصر الفاظ میں قلمبند کر دینے کا جو سلسلہ باب الاستفسار میں شروع ہوا ہے اور جس سلسلہ میں انقلاب فرانس اور ہندوستان پر آپ نے معلومات فراہم کی ہیں، بہت مفید ہیں۔ براہ کرم اسی انداز سے گزشتہ جنگ عظیم پر بھی اظہار خیال فرمایئے۔

(نگار) جنگ عظیم سے وہ بین الاقوامی جنگ مراد ہے جو اگست ۱۹۱۴ء سے نومبر ۱۹۱۸ء تک دنیا میں جاری رہی

اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ سراجیو (Serajevo) میں جو یگوسلیویا کا مشہور شہر ہے، فرانسیس فرڈیننڈ (Francis Ferdinand) کو سربیا کے ایک باشندے نے قتل کر دیا۔ آسٹریا نے انتقاماً جولائی ۱۹۱۴ء میں سربیا پر حملہ کر دیا۔ روس سربیا کی مدد پر آمادہ ہو گیا اور جرمنی، آسٹریا کی حمایت پر۔ چونکہ فرانس و روس کا اتحاد تھا اس لئے فرانس کے خلاف بھی اعلان جنگ کر دیا گیا اور بلجیم پر حملہ کرنے کی وجہ سے برطانیہ کو بھی اس میں حصہ لینا پڑا۔ لڑائی شروع ہونے کے بعد ترکی اور بلغاریہ بھی جرمنی کے ساتھ شریک ہو گئے۔

ان فریقین میں، اتحادیین (یعنی فرانس، برطانیہ و روس) کے ساتھ ۱۹۱۵ء میں جاپان اور اٹلی نے اور ۱۹۱۶ء میں رومانیا نے بھی شرکت کر لی۔ بعد کو پرتگال بھی ساتھ ہو گیا اور اپریل ۱۹۱۷ء میں امریکہ بھی۔

اس جنگ میں ۳۰ کروڑ مسلح سپاہیوں نے حصہ لیا اور جتنا روپیہ اس میں صرف ہوا اس کی نظیر تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس جنگ کے دو محاذ تھے شرقی اور غربی۔ مغربی محاذ میں جرمنی کے مقابل برطانیہ و فرانس تھے اور مشرقی محاذ میں روس۔ اٹلی کے حدود میں جو لڑائیاں ہوئیں انھیں مغربی محاذ ہی کا حصہ سمجھنا چاہئے اور بلقان کی جنگ کو مشرقی محاذ کا حصہ۔ ترکی نے گیلی پولی اور عراق میں اتحادیین کو الجھائے رکھا۔

جرمنی کے مستعمرات پر بھی حملہ کیا گیا۔ چنانچہ جاپان نے کیاؤچو پر قبضہ کر لیا اور افریقی مستعمرات بحر جنوب کے جزائر پر برطانیہ قابض ہو گیا۔

اتحادیین اور خصوصیت کے ساتھ برطانیہ کے بحری بیڑے نے بڑا کام کیا، کیونکہ بغیر اس کے افواج اور سامانِ حرب کی نقل و حرکت دشوار تھی۔ اس بیڑے نے جرمن بیڑے کو باہر نہ نکلنے دیا اور تمام جرمن بندرگاہوں کا راستہ مسدود کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ جرمن آبدوزوں نے ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں اتحادیین کے جہازوں کو بہت نقصان پہونچایا لیکن اس سے کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔

۱۹۱۴ء میں جرمن افواج پیرس کے قریب تک پہونچ گئیں اور روس مشرقی پروشیا اور آسٹریا پر حملہ آور ہوا لیکن یہ دونوں اقدامات ناکام رہے۔ ۱۹۱۵ء میں زیادہ تر خندقوں کی لڑائی ہوئی جو ساحل بلجیم سے لیکر سوئٹزرلینڈ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی سال برطانوی افواج نے گیلی پولی پر قبضہ کر لیا لیکن اختتام سال سے قبل ہی انھیں واپس ہونا پڑا۔ عراق میں جنگ کرنے کے لئے ہندوستانی فوج بھیجی گئی تھی لیکن وہ بھی ناکام رہی۔ روس کی کامیابیاں بھی عارضی ثابت ہوئیں اور پولینڈ پر جرمنی افواج چھا گئیں۔ سربیا کا بھی یہی حشر ہوا اور اٹلی بھی آسٹریا کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

۱۹۱۶ء میں برطانیہ میں وہ مشہور حملہ کیا جو جنگِ سوم کے نام سے مشہور ہے اور فرانس اور جرمن میں ورڈون کے قبضہ کے لئے نہایت سخت جنگ ہوئی۔ جرمن نے رومانیا کو فتح کر لیا اور برطانیہ کو عراق میں شکست ہوئی

روس بھی بہت کمزور پڑ گیا اور اٹلی تو خیر پہلے ہی سے مضمحل تھا۔

۱۷ء کا خاص واقعہ امریکہ کی شرکت اور روس کا ڈھیر ہو جانا ہے جس نے آخری بار اپنی پوری کوشش ختم کر دینے کے بعد جرمن سے صلح کر لی اور اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ اسی سال اٹلی کی مدد کے لئے برطانوی اور فرانسیسی افواج بھی روانہ کی گئیں کیونکہ اُسے آسٹریا کے محاذ میں شکست ہوئی تھی۔

۱۸ء میں اپنی آخری جارحانہ جنگ میں انگریزوں کو سخت شکست دی اور فرانسیسیوں کو پیرس تک بھگا چھوڑا لیکن امریکن افواج کی آمد نے ہوا کا رُخ بالکل بدل دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی اور اس کے ساتھیوں کو ہر جگہ شکست پر شکست ہونے لگی۔ جرمنی کے ہاتھ سے تمام مفتوحہ علاقے نکل گئے، آسٹریا، اٹلی سے مغلوب ہو گیا، ترکی فوجیں بھی تباہ ہوئیں اور بلغاری سپاہ بھی۔ آخر کار انھوں نے یکے بعد دیگرے صلح کی درخواست کی اور ۱۱ نومبر ۱۸ء کو یہ جنگ ختم ہو گئی۔

شرائط صلح پیرس میں بیٹھکر طے کئے گئے اور جس صلحنامہ کی رو سے یہ لڑائی ختم ہوئی اس کا نام صلحنامہ ورسیلز ہے

اس جنگ سے جرمنی کو یورپ میں جو سخت نقصان پہونچا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۲۷۲۵۰ مربع میل ملک اور ساڑھے چھ ملین آبادی اس کے ہاتھ سے نکل گئی یورپ سے باہر ۱۱۲۸۰۰۰ مربع میل زمین اور تیرہ ملین آبادی اس کی حکومت سے علٰحدہ ہو گئی۔

اس صلحنامہ کی رو سے السا ک اور لورین، فرانس کو ملے، زیرین سلیشیا، پولینڈ کو دیا گیا، اضلاع میمل، لیتھونیا کو دئے گئے، شلسوگ کا ایک حصہ، ڈنمارک کو ملا اور متحدہ سرحدی اضلاع بلجیم کو۔ سواحل رہائن کو غیر مسلح کر دیا گیا، سار کا علاقہ بین الاقوامی کمیشن کے انتظام میں دیدیا گیا اور مستعمراتی مقبوضات اتحادیئن کے ہاتھ آگئے۔

آیندہ جنوری ۳۹ء کا نگار

یعنی مصحفی نمبر طیار ہے

اور اپنی جامعیت کے لحاظ سے اُردو شاعری کی تاریخ میں بالکل پہلی چیز ہے — مصحفی کا مرتبہ اسوقت تک لوگوں نے نہیں پہچانا اور اب بالکل پہلی مرتبہ آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کیسی غیر معمولی ہستی تھا —

مصحفی کے غیر مطبوعہ دواوین اور غیر مطبوعہ مثنویوں کا انتخاب — مصحفی کی غزلیات پر بالکل جدید اُصول انتقاد کے لحاظ سے تفصیلی تبصرہ — مصحفی کے شاگردوں کے متعلق ایک عالمانہ ریسرچ — مصحفی کے تذکروں اور دیگر تصانیف پر ایک فاضلانہ انتقاد — اور اسی طرح کے بہت سے عنوانات پر بے مثل مضامین آپ کو اس نمبر میں نظر آئیں گے۔ ضخامت کا اندازہ ۲۰۰ صفحات کیا گیا ہے لیکن ممکن ہے اس سے بڑھ جائے۔ غیر خریداران نگار کے لئے اس نمبر کی قیمت دو روپیہ مقرر ہے — اگر آپ نگار کے خریدار نہیں تو خریداری کے سلسلہ کو جاری رکھئے تاکہ یہ نمبر آپ کو مل سکے۔

مینیجر نگار۔ لکھنو

غم

سجھے اے فطرتِ انساں مسرت کی تمنا ہے
اسی کو حاصلِ عمرِ دو روزہ تو نے سمجھا ہے

نشاط و عیش ہی تیرے لئے سب کچھ ہیں دنیا میں
نہیں کچھ اور گنجائش تری چشمِ تماشا میں

مگر ناداں یہ تیری بھول ہے، یہ تیری غفلت ہے
جسے تو نے سمجھ رکھا ہے عشرت، وجہ کلفت ہے

نشاط و عیش کے مفہوم سے ناآشنا ہے تو
فریبِ زندگی کی شعلہ رنگی پر فدا ہے تو

ابھی اک دائمی عشرت سے ناواقف ہے دل تیرا
تجھے بڑھنے نہیں دیتا ہے ذوقِ مضمحل تیرا

ابھی محروم ہے تو لذتِ غم کی لطافت سے
ابھی تاباں کہاں ہے دل ترا دردِ محبت سے

ابھی پیدا نہیں ہے سوزِ فطرت تیرے سینے میں
ابھی مصروف ہے تو بادۂ بے کیف پینے میں،

جو ہو جائے رسا تیری نظر غم کی حقیقت تک
تو اک دن تو پہونچ جائے وقارِ آدمیت تک

اگر ہے روح تیری تشنہ و مضطر تو جرأت کر
نشاطِ زندگی کو مستقل کرنے کی صورت کر

وہ خوش قسمت ہے جس کو نعمتِ غم شاد کرتی ہے
یہ وہ دولت ہے جس سے روح کی دنیا سنورتی ہے

نیازِ عشق میں ہوتی ہے غم سے دلکشی پیدا
جبینِ شوق سے ہوتا ہے نورِ بندگی پیدا

ظہورِ غم سے جذبے روح کے بیدار ہوتے ہیں
سلیقے نالہ و فریاد کے ہموار ہوتے ہیں،

جسے عرفانِ غم حاصل ہوا سب کچھ ملا اس کو
جو سچ پوچھو تو حاصل ہو گیا قربِ خدا اسکو

خلش غم کی رسا ہوتی ہے جب سازِ رگِ جاں تک
تو پہونچاتی ہے انساں کو تجلی گاہِ یزداں تک

نمودِ غم سے عزت بڑھ گئی انساں کی ہستی کی
حقیقت ماند ہو کر رہ گئی عشرت پرستی کی

یہ وہ میخانہ ہے جس کی شرابِ تند پینے سے
کثافت کے نقوشِ تیرہ دھل جاتے ہیں سینے سے

بطورِ خاص یہ دولت عطا ہوتی ہے انساں کو
یہ وہ نعمت ہے جو دیتی ہے تسکیں چشمِ گریاں کو

نشاطِ غم سے تکمیلِ طلب ہوتی ہے دنیا میں
بہاریں خود چلی آتی ہیں آغوشِ تمنا میں

یہ وہ آتشکدہ ہے جس میں کوثر کی لطافت ہو
یہ ہے وہ پھول ہر پتی میں جس کی ایک جنت ہے

یہ وہ مضراب ہے جو چھیڑتی ہے ساز کے پردے
یہ وہ جذبے ہے اُٹھ جاتے ہیں جس سے راز کے پردے

خزانے ہیں اسی لذت میں پنہاں زندگانی کے
دکھاتی ہے یہی جلوے حیاتِ جاودانی کے

یہی قوت رسا تا حدِ نورِ عرش ہوتی ہے
یہی طلعت ہے وہ جس میں خدا کی یاد سوتی ہے

احمد ندیم قاسمی

غزلیات :۔

سکندر علی وجد بی۔اے (عثمانیہ)

(۱)

یہ راز اہلِ ہوس کی سمجھ میں آ نہ سکا
جو پاس آ نہ سکا، تجھ سے دور جا نہ سکا

جو دل کہ فاش کنِ رازہائے ہستی تھا
حریمِ ناز کا پردا کبھی اُٹھا نہ سکا

ملے تو زہرِ ہلاہل سمجھ دلِ ناداں!
وہی تو آبِ بقا تھا، جو ہاتھ آ نہ سکا

وفورِ غم کا بُرا ہو میں آج پیشِ حبیب
طلوعِ شمس و قمر پر بھی مُسکرا نہ سکا

کیا تھا عشق نے بھی آج اہتمامِ فریب
پتہ کی بات مگر رنگِ رخ چھپا نہ سکا

بیانِ غم میں بڑی احتیاط لازم ہے
تمام عمر وہ مجھ سے نظر ملا نہ سکا

سدا جنوں کو سمجھتا رہا لمالِ حیات
شریر عقل کے پھندے میں وجد آ نہ سکا

(۲)

کہاں تھی مجھ میں سکت زور آزمائی کی
اُٹھائیں عشق نے سب سختیاں زمانے کی

مری نظر نے کیا کام گُدگُدانے کا،
نگاہ ناز تھی تمہید مُسکرانے کی

مآلِ جذبۂ تکمیل اے معاذ اللہ!
عجیب چیز تھی دُھن آشیاں بنانے کی

اُسی ادا سے پھر اک بار کوند اے بجلی،
چمک کے رہ گئی تقدیر آشیانے کی

رہیگا وجد بیاں، عشق کا سدا یکساں
بدلتی جائیگی سرخی فقط فسانے کی

گورنمنٹ پبلک لائبریری رامپور (اسٹیٹ)

ایک ضروری اطلاع

تاریخ اسلامی ہند کی پہلی جلد "حملۂ بابر" تک اس مہینے میں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس جلد کا نہایت ضروری ضمیمہ علٰحدہ شائع کیا جا رہا ہے، یعنی ۱۵ھ (۱۵۰۶ء) سے لیکر ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) تک کی سلسلہ وار توقیت (Chronology)

یہ نقشہ یا سلسلہ وار تاریخی واقعات کا تختہ "نگار" کے ۸۰ صفحات کو محیط ہوگا اور پہلی جلد کے ساتھ اس کا حاصل کرنا ازبس ضروری ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا مفصل تاریخی انڈکس ہے جس سے فوراً یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کس تاریخ میں کونسا اہم واقعہ پیش آیا۔ اسی کے ساتھ سب سے بڑی خصوصیت ایک یہ بھی ہے کہ انگریزی اور ہجری سنہ دونوں مطابق کرکے درج کئے گئے ہیں۔

اس کی قیمت بہت کم یعنی مع محصول بارہ آنے رکھی گئی ہے تاکہ تمام قارئین نگار جن کے پاس تاریخ اسلامی ہند کی پہلی جلد پہونچ چکی ہے اس کو آسانی سے حاصل کر سکیں

اس خیال سے کہ بارہ آنے کی رقم بھیجنے میں آپ کو فیس منی آرڈر دو آنہ زیادہ نہ ادا کرنا پڑے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سال آیندہ کے چندہ کے ساتھ بارہ آنے زیادہ بھیج دیجئے یا اجازت دیجئے کہ جنوری کے وی پی میں اس رقم کا اضافہ کر دیا جائے۔ اس طرح آپ کو بچت ہو گی۔ اس لئے براہِ کرم جو صاحب اس کو پسند فرماتے ہیں وہ ذریعہ کارڈ اطلاع دیدیں تاکہ جنوری کے وی پی میں یہ رقم بڑھا دیجائے۔ جن حضرات کی کوئی اطلاع نہ آئے گی ان کو وہی معمولی رقم کا وی پی روانہ کیا جائے گا۔ توقیت کا نمونہ دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

منیجر "نگار"

نمونہ (صفحہ اول)

توقیت

یعنی سلسلہ وار واقعات تاریخی کا نقشہ

سنہ ۱۵ھ (سنہ ۶۳۶ء) سے سنہ ۹۳۲ھ (سنہ ۱۵۲۶ء) تک

سنہ ۱۵ھ / ۶۳۶ء — عثمان بن ابی العاص ثقفی گورنر بحرین و عمان نے عہد خلیفہ ثانی میں اپنے بھائی حکم کو بحرین میں مقرر کر کے حکم دیا کہ "ہندوستان پر حملہ کریں" اسی زمانہ میں دوسرا حملہ حکم نے بھروچ پر کیا۔ اور اپنے بھائی مغیرہ کو دیبل روانہ کیا جہاں انھوں نے دشمن کو شکست دی۔ چچ نامہ میں لکھا ہے کہ یہ شہید ہوئے۔

سنہ ۲۲ھ / ۶۴۳ء — عبداللہ ابن عمرو ابن ربیع نے کرمان پر حملہ کیا، اور پایۂ تخت کو لے لیا، سیستان کو زیر کیا، اور مکران پر حملہ کر کے مکران اور سندھ کی متحدہ افواج کو شکست دی۔ خلیفہ ثانی نے دریائے سندھ کو عبور کرنے کی ممانعت فرمائی۔ محمد الشیرازی، سیستان کا فاتح عمرو ابن التمیمی اور عبداللہ ابن عمر خطاب کو ظاہر کرتا ہے۔ اور مکران کا فاتح عبداللہ ابن عبداللہ ابن عثمان کو بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "زنبیل، مکران، اور سندھ دونوں جگہ کا حکمران تھا" بعض مورخوں نے ناموں میں اختلاف کیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ فتح سنہ ۲۳ھ میں ہوئی ہے۔

سنہ ۳۵ھ / ۶۵۵ء — عبدالرحمن ابن سمرہ کو گورنر عراق نے سیستان پر حملہ کرنے کے لئے مامور کیا۔ اس نے بست (Bust) لے لیا اور کابل تک بڑھتا چلا گیا۔

سنہ ۴۴ھ / ۶۶۴ء — عبدالرحمن ابن شمر نے مرو سے کابل پر حملہ کیا، اور یہاں بارہ ہزار نفوس کو مسلمان کیا، اس فوج کا ایک افسر مہلب ابن صفرہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے مامور کیا گیا۔ یہ ملتان تک بڑھتا چلا گیا اور بہت سے قیدی لیکر خراسان آیا۔